کھلونے والا
(افسانے)
قدیر زماں
فورم فار ماڈرن تھاٹ اینڈ لٹریچر، حیدرآباد
Meer Zaheer Abass Rustmani

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

کھلونے والا

(افسانے)

قدیر زماں

فورم فار ماڈرن تھاٹ اینڈ لٹریچر، ملک پیٹھ، حیدرآباد

Khilone-Vala (Short Stories)

By Kadir Zaman

16-10-49, New Malakpet, Hyderabad - 500 036 (INDIA)

کھلونے والا (افسانے) - قدیر زماں

بار اول ۲۰۰۵ء

تعداد پانچ سو

Phone : 9246152456

کمپیوٹر کتابت الاکرم گرافکس، سعید آباد، حیدرآباد

طباعت اے-ایس-گرافکس، حیدرآباد

سرورق داستان گو (Story-teller)

عمل : امریتا شیرگل

قیمت -/200 روپے

ISBN : 81-900859-4-8

•••• ملنے کے پتے ••••

ناشر : ادارۂ جدید فکر و ادب، 16-10-49 ملک پیٹھ، حیدرآباد - 036 500

حسامی بک ڈپو، گلزار حوض، حیدرآباد - 002 500

سب رس کتاب گھر، ادارۂ ادبیات اُردو، پنجہ گٹہ، حیدرآباد - 082 500

دارالکتاب، میور کشال کامپلکس، گن فاؤنڈری، حیدرآباد - 001 500

شب خون کتاب گھر، 313 رانی منڈی، الٰہ آباد - 211003

حسن چشتی، 7033 North Kedzi 112 #، شکاگو U.S.A IL-60645

یہ کتاب اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کی جزوی مالی امداد سے شائع کی گئی ہے

رفیقِ حیات ڈاکٹر اکبر قادری

کے نام

اظہارِ ممنونیت

سن ۱۹۶۳ء تا ۱۹۶۹ء ''صبا'' (حیدرآباد) نے میرے چار افسانے شائع کیے۔
پھر ''سب رس'' (حیدرآباد) اور ''شعر و حکمت'' (حیدرآباد) میں چھپتا رہا۔
سن ۲۰۰۱ء تا ۲۰۰۵ء ''شب خون'' (الہ آباد) سے پانچ افسانے شائع ہوے۔

'صبا' کے مدیر سلیمان اریبؔ، 'سب رس' اور 'شعر و حکمت' کے مغنی تبسمؔ اور 'شب خون' کے شمس الرحمٰن فاروقی نے میرے افسانوں کو بڑے جتن سے شائع کیا۔ فاروقی صاحب نے تو میرے اُن افسانوں کو جو شب خون میں چھپے، چند نئے لفظ دیے اور ان کے مفید مشوروں کو قبول کرنے کی وجہ سے میرے افسانوں میں نکھار آیا۔ میں اپنے ان مشفق احباب کا ممنون ہوں کہ ان کے بغیر میرے افسانے صرف کتابوں کی زینت بنے رہتے اور شاید معتبر قارئین تک پہنچ نہ پاتے۔

ترتیب

ایک صحیفہ

ابرار جس قبرستان کا متولی تھا وہ ایک ندی کے کنارے بسا تھا۔ ابرار کے دادا، پردادا بھی اس کے نگران کار تھے۔ ابرار نے بچپن میں کبھی یہ بات اپنے دادا سے سنی تھی کہ اُن کے دادا کے دادا بھی اس قبرستان کے رکھوالے تھے۔ لیکن اب وہ صحیفے باقی نہیں رہے تھے جن میں اس خاندان کا ذکر ہوا تھا۔

ابرار کی ماں اکثر کہا کرتی تھی ''ندی میں چاہے کتنا ہی سیلاب آ جاے اس قبرستان کی دیوار تک اُس کا پانی نہیں پہنچے گا۔'' اس کی تصدیق کئی بزرگوں نے کی۔ ایک صدی قبل بڑا بھیانک طوفان آیا تھا۔ گاوں کے گاوں بہہ گئے، لیکن کیا مجال قبرستان کے اُوپر سے پانی کا ایک بھی ریلا گیا ہو۔ صرف اتنا ہوا کہ آس پاس کے چند درخت پیڑوں سے اُکھڑ گئے۔ ابرار کی ماں اپنی بات ختم کرنے سے پہلے کہا کرتی ''یہاں بھلے شاہ پیر کی قبر ہے۔ بس ان ہی کی کرامات ہیں۔ یہ قبرستان محفوظ ہے۔'' خود بھلے شاہ پیر کب پیدا ہوے، کہاں رہے اور کب مرے اور وہ کس قبر میں دفن ہیں اِن کی کوی تاریخ نہیں تھی اور نہ کوی نشان تھا۔

اب ابرار بہت بوڑھا ہو چکا تھا اور چاہتا تھا کہ مرنے سے پہلے اس قبرستان کی نگرانی اپنے نوجوان پوترے جنید کے حوالے کر دے۔ جنید نے اپنے بچپن سے لے کر جوانی تک بڑے ہی بھیانک مناظر دیکھے تھے۔ کتنے ہی اپنے پراے رائفلوں کی گولیوں اور بموں کی نذر ہو چکے تھے۔ طفلی میں ماں باپ کی گود میں رہ

کر اُسے تو کچھ سمجھ میں نہ آیا تھا کہ اس گھمسان رن کا سبب کیا ہے۔ کئی احباب اس قبرستان کی حفاظت کرتے ہوئے مارے جا چکے تھے۔ کبھی اپنے حق کے لیے، کبھی عزت و ناموس کے لیے اور کبھی رنج و الم سے بے قابو ہو کر یہ لوگ دُشمن پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھتے اور اُس کی گولیوں کا نشانہ بنتے۔ قوم اور کنبے کے لوگ چونٹیوں کی طرح مسلے گئے تھے۔ جنید کے ماں باپ بھی اسی انجام کو پہنچے تھے۔ جنید کو حیرت تھی کہ وہ اور اُس کے دادا اب تک کس طرح سے زندہ رہ گئے۔ چند دھندلی سی یادیں تھیں اور چند واضح مناظر۔ دُشمن کی گولیوں سے بچنے کے لیے جنید کو گود میں لیے اُس کے دادا کبھی قبرستان کی دیوار کی آڑ میں ہو جاتے یا پھر کسی ایسی قبر میں چھپ جاتے جو زمین کی سطح سے نیچی ہوتی۔

ایک دن دادا نے اپنے پوترے کو قریب کرتے ہوئے بڑی شفقت سے کہا۔ ''جنید بیٹے۔ میرے دن پورے ہو چکے۔ اب اس قبرستان کی رکھوالی تمہارے ذمہ کیے دیتا ہوں۔ جب تک زندہ ہوں تمہارے ہی ساتھ رہوں گا۔''

آنکھیں پھاڑتے ہوئے جنید نے اپنے دادا کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ سوچتا ہوا رُک رُک کر کہنے لگا

''دادا جان۔ ہمارا خاندان کب تک اس قبرستان کی نگرانی کرتا رہے گا۔ میرے بعد تو اب کوئی رہا بھی نہیں۔''

''کیوں نہیں بیٹے! میں اپنے مرنے سے پہلے تمہارا نکاح کروادوں گا۔ پھر تمہارے بچے ہوں گے پھر اُن کے بھی بچے ہوں گے۔ یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ خدا کبھی ایسا نہیں ہونے دے گا کہ ہماری نسل کا ایک آدمی بھی باقی نہ رہے اور اس قبرستان پر کسی دوسرے کا قبضہ ہو جائے۔ خدا نے یہ زمین ہمیں عطا کی ہے اور اُس کا وعدہ ہے کہ قیامت تک یہ ہمارے ہی قبضے میں رہے گی۔''

''دادا جان ایک خدا نے یہ زمین ہمیں دی ہوگی۔ کوئی دوسرا خدا جو زیادہ طاقتور ہوگا اسے ہم سے چھین لے گا۔'' جنید نے بڑی روانی کے ساتھ یہ جملہ ادا کیا تو دادا نے اُسے ٹوکا۔

''کوئی دوسرا طاقتور خدا؟''

لیکن جنید نے اپنے دادا کی بات کاٹی۔ وہ اُسی روانی سے کہنے لگا۔

''دادا جان میں تو یہ بھی سوچتا ہوں کہ کیا صرف انسان ہی اپنے اپنے خدا کے نام پر ایک دوسرے کا قتل کرتے رہیں گے۔ کبھی ایک خدا دوسرے خدا کو کیوں نہیں مارتا؟ وہ نہ رہے گا تو اُس کا نام لیوا بھی کوئی نہ رہے گا۔''

''کیوں ایسے بدعت کے کلمات اپنی زبان سے نکالتے ہو۔ دوسرے خدا کا وجود کہاں؟ اچھا کیا تم نے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تمھیں اُس راز سے واقف کروا دوں جس سے میں واقف ہوں۔ اس وقت نہیں تو ممکن ہے آگے چل کر تمھیں وہ بصیرت حاصل ہو جائے جسے میں نے برسوں کی ریاضت کے بعد حاصل کی ہے۔''

یہ کہہ کر ابرار نے جنید کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اُسے لے کر قبرستان کے ایک کونے میں پہنچ گیا۔

''اب یہاں میرے ساتھ آنکھیں بند کیے مراقبے میں بیٹھو اور اُن آوازوں کو سنو جنھیں میں برسوں سے سنتا آ رہا ہوں۔ ذرا دھیان سے کان لگا کر سننا۔'' یہ کہہ کر ابرار مراقبے میں بیٹھ گیا۔ اُس کے ساتھ ہی جنید بھی اُس کے پہلو بہ پہلو بیٹھ گیا۔ دونوں نے اپنی آنکھیں بند کیں اور آوازوں کی طرف دھیان لگایا۔

سنسان مقام پر پتہ بھی کھڑکے تو زور کی آواز آتی ہے۔ درختوں سے گرے ہوئے سوکھے پتے ہوا کے چلنے سے آپس میں ٹکرا کر کھڑ کھڑ کرنے لگے تھے۔ کھڑ کھڑ اور سائیں سائیں کی آوازیں جاری تھیں۔ اِن ہی میں سے چند اور بلند آوازیں اُٹھ رہی تھیں۔

''جہاں تم بیٹھے ہو وہاں قدیم زمانے میں چند انسان نما حیوان بستے تھے۔ وہ پورے حیوان بھی نہیں تھے کہ اُنھیں اپنے رنگ و روپ اور ناک نقشے کی شناخت تھی۔ جیسے جیسے اُن کی شناخت کی قابلیت بڑھتی گئی وہ ایک دوسرے کے لیے ناگوار ہوتے گئے۔ پھر کیا تھا طاقتور نے کمزور کو اپنا غلام بنانا شروع کیا اور جب چاہا اُسے مار بھی ڈالا۔ کمزوروں کو مار کر، اُن کا مال لوٹ کر طاقتور اپنی بھوک مٹانے کے لیے کسی اور جگہ کی تلاش میں نکل پڑے۔ اس طرح مارے گئے اُن تمام لوگوں کی ہڈیاں اس مٹی میں شامل ہیں جہاں تم اب بیٹھے ہو۔ مارنے والوں کے نشان نہ تو اب جنت میں ہیں نہ دوزخ میں کیوں کہ اُس وقت تک کوئی صحیفہ زمین پر نہیں آیا تھا۔ زبان کی کوئی گرامر بھی نہیں بنی تھی۔ اسی لیے ان کی کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔''

اتنا سن کر ابرار نے آنکھیں کھول دیں اور جنید کو ٹوکا۔

''سنا تم نے ان آوازوں کو؟''

''دادا جان مجھے تو کوئی آواز سنائی نہیں دی۔'' جنید نے جواب دیا۔

''اچھا تو اب یہاں سے چلو۔ اس دفعہ زیادہ دھیان لگا کر سننا۔''

یہ کہہ کر ابرار نے جنید کا ہاتھ پھر سے اپنے ہاتھ میں لیا اور اُسے لے کر قبرستان کے دوسرے کونے

پر پہنچا۔

جنید اپنے دادا کے ساتھ پھر ایک بار مراقبے میں بیٹھ گیا۔ ہوائیں تیز چل رہی تھیں۔ سوکھے پتے زیادہ ہی کھڑ کھڑانے لگے۔ آوازیں آنے لگیں۔

''یہ وہ جگہ ہے جہاں کسی زمانے میں ایک خاندان آباد تھا۔ تمہاری سیدھی جانب ایک کنواں تھا۔ اس کنویں کا پانی وہ لوگ نہ صرف پیتے تھے بلکہ اس سے کھیتی باڑی کا سارا کام بھی انجام پاتا تھا۔ وہ جنگلی جانوروں کا شکار بھی کرتے تھے۔ بڑی خوش حال زندگی تھی کہ ایک صبح اچانک کہیں سے چار گھڑ سوار آدھمکے۔ ہاتھوں میں اُن کے بھالے اور خنجر تھے۔ پہلے اُنھوں نے خاندان کے مردوں کو مار ڈالا۔ پھر عورتوں کو مارا اور اُن کے زندہ بچوں سمیت نعشوں کو اس کنویں میں پھینک دیا۔ چند گھنٹوں میں سب کچھ لوٹ کر اور گھاس پھوس کے بنے گھروں کو آگ لگا کر وہ چاروں گھڑ سوار جس طرف سے آئے تھے اُسی طرف چلتے بنے۔ کنویں کی تہہ میں اُن مردوں کے فوسل ابھی بھی موجود ہیں لیکن اُن تک پہنچنے کے لیے زمین کی کئی اور تہوں سے گذرنا پڑے گا اور ہر تہہ میں مختلف طرح کی ہڈیوں کے فوسل ہیں۔ اب وہ چاروں گھڑ سوار اور اُن ہی کی طرح کے کئی اور لوگ دوزخ کے دہانے پر پڑے کراہ رہے ہیں۔ اُن کے جسموں کو سانپ ڈس رہے ہیں۔ اُن کے ہونٹ اونٹ کے ہونٹوں کی طرح موٹے ہیں اور وہ خاردار جھاڑیاں چبا رہے ہیں۔ اُن کے منہ لہولہان ہیں۔ اُن کے پیٹوں میں خنجر گشت کر رہے ہیں۔''

جنید کو یہ آوازیں بھی سنائی نہیں دیں۔

''جب تک تم ان آوازوں پر پوری طرح دھیان نہیں دو گے یہ تمہیں سنائی نہیں دیں گی۔'' یہ کہتے ہوئے ابرار نے تیسری بار جنید کا ہاتھ پکڑا اور اُسے لے کر قبرستان کے تیسرے کونے پر پہنچا۔ وہ دونوں پھر ایک بار مراقبے میں بیٹھ گئے۔ ہوائیں کبھی آہستہ اور کبھی تیز چلتی رہیں۔ اُسی مناسبت سے پتوں کے کھڑ کھڑانے کی آواز آتی رہی۔ اس دفعہ بھی غیبی آوازیں صرف ابرار نے سنیں۔

''تم جہاں بیٹھے ہو وہاں سے شمال و جنوب کی طرف دور دور تک جتنے واقعات ہو چکے ہیں اُن کی طویل داستان ہے۔ یہاں نئے نئے قافلے آتے رہے۔ ایک نے دوسرے کو بے دخل کیا۔ جو بھاگ گیا سو بھاگ گیا۔ جو مارے گئے وہ یا تو چیل کوؤں کی غذا بنے یا زمین میں دفن ہو گئے۔ کسی دور میں یہاں ایک مضبوط قلعہ بھی بنایا گیا تھا۔ وہ بھی مسمار ہوا۔ کبھی حکمرانوں نے باغیوں کی چمڑیاں اُدھیڑ دیں اور کبھی باغیوں نے حکمرانوں کی۔ کبھی یہاں نعشوں کے انبار بھی لگے تھے۔ اب یہاں آسمانوں میں کتنے ہی لوگ

جنت و دوزخ کے درمیان دوڑتے پھر رہے ہیں۔ اُن کی گردنوں میں طوق ڈال دی گئی ہے۔ بعض لوگوں کے پاوں میں موٹی موٹی زنجیریں ہیں۔ وہ دوڑنا چاہتے ہیں لیکن دوڑ نہیں سکتے۔ اُنھیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ وزنی پتھر اُٹھاتے رہیں۔ جب اُن کے ہاتھوں سے پتھر چھوٹ جاتے ہیں تو اُن پر کوڑے برستے ہیں۔ کوڑوں کی تاب نہ لاکر وہ پھر سے وزنی پتھر اُٹھالیتے ہیں۔ پتھروں کے وزن سے اُن کی سانس اُکھڑتی ہے۔ پھر یہ عمل دہرایا جاتا ہے۔''

آوازیں ختم ہوئیں تو ابرار نے جنید سے کہا ''تم نے یہ آواز بھی نہیں سنی ہوگی۔''

''نہیں سنی دادا جان؟'' میں ایسی کوئی آواز شاید سن نہ پاؤں گا۔ آپ اگر سن رہے ہیں تو آپ سچ ہی کہہ رہے ہوں گے۔ لیکن دادا جان آپ کی عمر کو پہنچنے کے لیے مجھے تو ایک لمبا عرصہ درکار ہے۔ یہاں تو گھڑی دو گھڑی بھی زندہ رہنا کسی معجزہ سے کم نہیں۔'' جنید نے کہا۔

''مایوس نہ ہونا بیٹے۔ چلو اب ایک آخری جگہ رہ گئی ہے۔ اُسے بھی آزمالیں گے۔''

ابرار جنید کو لے کر قبرستان کے چوتھے کونے پر پہنچا۔ وہ دونوں آخری بار اُسی طرح مراقبے میں بیٹھ گئے جیسے ابھی تک بیٹھتے رہے تھے۔ ہوائیں ساکت ہوگئیں تھیں۔ پتوں کے کھڑکھڑانے کی آوازیں بھی نہیں تھیں۔

''یہ زمین مختلف نہیں ہے۔ یہاں وہ سب کچھ ہو چکا ہے جو تم ابھی تک سنتے آئے ہو۔ یہاں بے شمار قومیں آباد ہوئیں۔ آخری بار اُن قوموں نے جمہوریت کا نعرہ لگایا اور انسانی حقوق کی بات کی۔ شہر میں ہر مکتبِ خیال کی درس گاہیں بنائی گئیں۔ ساتھ میں لوگوں نے طرح طرح کی عبادت گاہیں بھی بنالیں، ہر شخص نے اپنے اپنے عقیدے کی ایک عبادت گاہ تعمیر کرلی۔ اَن گنت عبادت گاہیں بنیں اور انھیں کے نام پر اَن گنت انسانوں کے خون بہائے گئے۔ سارا خون خشک ہوتا گیا۔ مٹی مٹی ہی رہی۔ ان ادوار کے سارے لوگ برزق میں ساتویں آسمان کی طرف نظریں لگائے پڑے ہیں۔ ہر شخص اپنے شہید ہونے کی دہائی دے رہا ہے۔ اس کا فیصلہ ہونا باقی ہے۔''

آوازیں ختم ہوئیں اور ابرار نے آنکھیں کھولیں تو جنید کو ابھی تک مراقبے میں پایا۔

ابرار نے جنید کو کاندھے سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ''شاید اس دفعہ تم نے یہ آوازیں سن لی ہیں۔''

''دادا جان میں نے کہیں بھی کوئی آواز نہیں سنی۔ میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کی اور آپ کے ساتھ مراقبے میں بیٹھتا رہا۔ میرا دھیان تو اُن آوازوں کی طرف تھا جو دونوں طرف کی رائفلوں سے نکل

رہی ہیں۔

اتنے میں آسمان سے زوردار گرج کے ساتھ ایک بجلی چمکی ۔ دونوں یکلخت کھڑے ہو گئے اور آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔

ابرار نے کہا'' بیٹے کیا تم ان لکیروں کو دیکھ سکتے ہو جو بجلی کے چمکنے سے آسمان میں بنی ہیں۔''

''نہیں دادا جان میں نہ تو لکیریں ہی دیکھ سکا اور نہ کوئی غیبی آواز سن سکا۔لیکن اس دفعہ آپ نے کیا دیکھا۔'' جنید نے اپنے دادا سے سوال کیا تو دادا نے کہا۔''میں نے جو دیکھا ہے وہی سنا بھی ہے'' یہ کہہ کر دادا تھوڑی دیر خاموش ہو گئے تو جنید نے پھر کریدا۔

'' آپ نے کیا دیکھا اور کیا سنا دادا جی۔''

''میں نے دیکھا اور سنا ہے'انا رب العالمین' دادا نے جواب دیا تو جنید نے کہا۔

''ٹھیک ہے دادا جان۔آپ نے سنا اور دیکھا ہے تو رب العالمین سے التجا کیجیے کہ ایک اور ایسا صحیفہ انسانوں کے لیے بھیج دے جو اس زمین پر انسان کو نجات دلا سکے۔''

✠ ✠ ✠

گردش

اس کو اپنے پاؤں کے نیچے کی زمین کھسکتی ہوی محسوس ہونے لگی، لیکن اُسے تو اب بھاگ کر کہیں نہیں جانا ہے۔ وہ ثابت قدم رہے گا۔ اُس نے یہی فیصلہ کیا۔ کئی برس پہلے زندگی میں ایک بار اُسے بھاگنا پڑا تھا۔ یہی کوی پچاس برس ہوے ہوں گے۔ زیادہ یا کم بھی ہو سکتے ہیں۔ اُسے صرف ۱۸۵۷ء کا سنہ یاد رہ گیا تھا۔

سارا خاندان انگریزوں کے ہاتھوں مارا جا چکا تھا۔ ایک بیوہ بہن اور اُس کی سات، آٹھ سال کی لڑکی بچ رہے تھے۔ بہن اُس سے کوی دس سال بڑی تھی۔ آبا و اجداد کا تعلق فن سپہ گری سے تھا۔ خاندان کے کئی لوگوں نے ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی میں حصہ لیا تھا۔ سپاہی جب مغلوب ہو گئے تو انگریزوں نے انھیں چن چن کر قتل کیا۔ چند گولیوں کا نشانہ بنے، چند تختۂ دار پر لٹکائے گئے۔ بہتوں کو توپوں کے دہانوں پر باندھ کر گولے سے اُڑا دیا گیا۔ جن لوگوں نے دیوڑھیوں میں پناہ لی تھی اُنھیں دیوڑھیوں سمیت جلا دیا گیا، جنھوں نے بزرگوں کی خانقاہوں یا درگاہوں میں پناہ لی تھی انھیں خانقاہوں کو منہدم کر کے، یا درگاہوں کے دروازے توڑ کر کھینچ نکالا گیا اور سنگینوں کی نوک پر رکھ لیا گیا۔ اُس وقت نہ تو آفتاب نے اپنے رخساروں کو پیٹ کر نیلا کیا جب انگریز عورتوں اور بچوں کو ہلاک کیا جا رہا تھا اور نہ تو ہندوستانیوں کی قتل و غارت گری پر ماہتاب ہی زمانہ کے دل کا داغ

بن سکا☆ ۔ان کو تو گواہی میں بھی نہ لیا جا سکا۔

خود اُس نے تو کسی کو نہیں مارا تھا لیکن اب اُس کا جی چاہتا تھا کہ انگریزوں سے لڑے، لڑ کر جان دے دے، مقابلہ کرتے ہوئے مارا جائے۔ بے کسی اُس کا شیوہ نہیں تھا۔ جوشیلے اور نادان بھائی کے ارادوں کو بھانپتے ہوئے سیانی بہن نے خاندان کی دہائی دی۔

'' بیٹا اب تم اکیلے ہی خاندان کے چراغ ہو، تمہاری ہی ایک آس رہ گئی ہے۔ تمہیں زندہ رہنا ہے، میں نہیں چاہتی کہ میں مر جاؤں، میری اور میری بچی کی دیکھ بھال تم ہی کو کرنا ہوگی۔''

تینوں نفوس راتوں رات دہلی سے نکل پڑے۔ شیخ عبداللہ، حلیمہ اور زینب، نکلنے سے قبل تینوں نے مل کر پرانے صندوقوں اور الماریوں کو ٹٹولا۔ زر و مال، کپڑے لتے اور خاندانی شجرہ جو بھی تھا وہ ساتھ لے لیا۔ شجرہ میں شیخ عبداللہ کے اُوپر لکھا تھا شیخ احمد، اُس کے اُوپر تھا شیخ ابراہیم اور اُوپر جو نام لکھے ہوئے تھے وہ کچھ دھندلے پڑ گئے تھے اور بھی اُوپر غزنوی یا غوری کے الفاظ تھے مزید مٹے مٹے سے تھے۔ پہلے نادر شاہ درانی پھر احمد شاہ ابدالی کے حملوں کے دوران اِدھر سے اُدھر بھاگ دوڑ میں الفاظ کہیں کہیں سے کھرچ گئے تھے۔ یا ان پر خون یا آنسوؤں کے نشان تھے۔

شیخ ابراہیم نے اپنی بیماری کے آخری زمانہ میں شیخ عبداللہ کے ہاتھ میں شجرہ تھماتے ہوئے کہا تھا۔'' تمہارا باپ تو تمہارے سن بلوغ کو پہنچنے سے پہلے ہی اللہ کو پیارا ہوگیا۔ اب تم اس شجرہ کے مالک ہو، اسے سنبھال کر رکھنا۔''

دادا نے کچھ اور بھی وصیت کی تھی، ساری باتیں اُسے یاد نہ رہیں۔ تجرہ کو اُس نے اِدھر اُدھر سے پھر ایک بار دیکھا۔ زیادہ سوچنے کا وقت ہے نہ ضرورت۔ اُس نے فوراً باورچی خانے سے ایک چاقو اُٹھایا اور شجرہ کو چاک کرتے ہوئے اُس کے پرزے پرزے کر ڈالے۔

جنوب میں نظام الملک آصف جاہی ریاست ہی ایک ایسی تھی جہاں اُنھیں پناہ مل سکتی تھی۔ کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچ جایں تو کسی ایسے چھوٹے دُور افتادہ گاؤں میں پڑ رہیں گے جہاں حکومت کا کوی کارندہ پر نہ مارتا ہو۔ چند دن تو صحرا نوردی میں گذرے، پھر صوبہ متوسط، گجرات اور مرٹھواڑے سے ہوتے ہوئے چھپتے چھپاتے کئی مہینوں میں تینوں اورنگ آباد پہنچے تو نہ معلوم کیوں یہ شہر اُنھیں غیر محفوظ لگا۔ انھیں

☆ یہ اظہار بیان اسد اللہ خان غالب کے دستنبو (ترجمہ : پروفیسر خواجہ احمد فاروقی) سے لیا گیا اور تھوڑے سے ردّ و بدل کے ساتھ یہاں استعمال کیا گیا ہے۔

یہاں کی زمین سے بو ے دوستی نہ ملی۔ انگریزوں اور مرہٹوں کا کثرت سے آنا جانا الگ تھا۔ دو ہی دن میں انھوں نے کوچ کی ٹھانی اگر چہ کسل راہ بہت تھا۔ پربھنی، نا ندیڑ اور نظام آباد ہوکر کورٹلہ پہنچے۔ ہفتہ بھر قیام کے بعد شیخ عبداللہ کو محسوس ہوا کہ یہ مقام بھی غیر محفوظ ہے۔ چند مسلمان یہاں پہلے سے آباد ہیں۔ آبادی ایسی سڑک پر ہے جو ریاست کے دو ضلعوں اور چند قصبوں کو جوڑتی ہے۔ انگریز صاحبان کا بھی اکا دکا سپاہیوں کے ساتھ اس سڑک پر گذر ہوتا ہوگا یا کیا پتہ کوی مخبری کردے اور وہ یہاں پہنچ جایں۔ یہ سوچ کر ایک صبح تینوں وہاں سے اور بھی جنوب کی طرف پا پیادہ چل پڑے۔ کئی چھوٹے چھوٹے گاوں چھوڑتے ہوے وہ ایک کوردہ سی جگہ پر پہنچے جس کا نام انھیں گھن پور بتایا گیا۔ شام کا وقت تھا، مویشیوں کو جنگل سے گاوں کی طرف ہانکا جارہا تھا۔ گاوں سے پرے جنوب و مشرق کی جانب چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور گھنے جنگل تھے۔ اس وقت آگے جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔

جس راستے سے یہ چھوٹا قافلہ گاوں پہنچا اُس کے داخلے پر ایک چرواہے کا مکان تھا۔ بعد میں شیخ عبداللہ کو پتہ چلا کہ ان چرواہوں کو آس پاس کے گاوں کے مسلمان دھنگر کہتے ہیں۔ اُس نے اسی دھنگر سے اُس رات سہارا مانگا۔ مرد کے ہاتھ میں ایک صندوق اور عورت اور بچی کے ہاتھوں میں کپڑے کی دو گٹھڑیاں دیکھ کر دھنگر سمجھ گیا کہ یہ لوگ مسافر ہیں اور شاید راستہ بھٹک گئے ہیں۔ زبان سے ناواقفیت کا مسئلہ الگ تھا۔ اشاروں میں باتیں ہویں، دھنگر نے سوچا اجنبی لوگ دو تین دن کے لیے اُس کے گھر میں رہنا چاہتے ہیں۔ اُس نے خوشی خوشی اُنھیں پناہ دی۔ مکئی کی تازہ روٹیاں بنوائیں، ترکاری کا ساگ اور بکریوں کے دودھ سے تیار کیا ہوا دہی کھانے کو دیا۔

صبح اُٹھ کر شیخ عبداللہ نے گاوں کا جائزہ لیا۔ جنوب مشرق کی طرف سے نکلتی ہوی چھوٹی سی ندی شمال کی طرف بہہ کر ایک تالاب میں جا گرتی تھی۔ گاوں میں ہر پیشے کے لوگ تھے اور کئی ذاتوں میں بٹے ہوے۔ دو ہزار سے کم کی آبادی والے اس گاوں میں ایک بھی مسلمان نہ تھا۔ گھن پور اُسے سب سے زیادہ محفوظ گاوں لگا۔ دھنگر کے گھر کو اُس نے چند دنوں کے لیے اپنا مسکن بنا لیا، دھنگر کو بھی کوی جلدی نہ تھی۔ جانوروں کو رکھنے کا ایک حصہ خالی تھا۔ یہ لوگ اسے کوٹّم کہتے تھے۔ شیخ عبداللہ نے کچھ پیسے دھنگر کے ہاتھ میں تھما دیے۔ سال بھر تک تینوں اُسی گھر میں رہے۔ گاوں والے خوش تھے کہ کوی ترکوڑ واُن کے گاوں میں آبسا ہے۔ آس پاس کے گاوں میں کبھی کبھی اُونچے پاجامے یا تہہ بند میں اُنھیں کوی ترکوڑ و نظر آتا تو گھن پور کے ہندو یہ سوچتے تھے کہ اُن کے گاوں میں ایسا کوی آدمی کیوں نہیں آیا۔

اس طرح شیخ عبداللہ پہلا ترکوڑ تھا جو گھن پور میں آبسا تھا۔ پھر بہت ہی جلد اُس نے اپنی فراست، محنت اور اپنے میزبان دھنگر کی مدد سے اپنے اثاثہ جات بڑھا لیے۔ آٹھ دس سال کی قلیل مدت میں وہ چار بھینسوں، دو گائیوں، ایک درجن بکریوں اور دو ایکڑ زمین کا مالک بن بیٹھا۔ بہن کو بھائی کا گھر بسانے کی فکر ہوی۔ اُس نے گھن پور کے قریب کے گاوں کلنور سے ایک لڑکی ڈھونڈ نکالی۔ لڑکی والے گھانا چلاتے اور مونگ پھلی اور تلوں کا تیل نکالا کرتے تھے۔ کلنور کے ایک ادھیڑ عمر مسلمان نے سوال کیا۔

''نام تو بہت بڑا ہے۔ شیخ عبداللہ، لیکن اس کے خاندان کا کوی اتہ پتہ بھی ہے؟'' اس پر لڑکی کے باپ نے گھن پور پہنچ کر پتہ لگایا۔ گاوں کے سارے ہندووں نے شیخ کی شرافت اور محنت کی داد دی۔

''اُس کے پاس تو چند جانور ہیں اور انباری پیٹھ میں دو ایکڑ تری زمین بھی ہے۔'' لڑکی والوں کو مزید کسی تفصیل کی ضرورت نہ تھی۔ شادی ہوگئی اور اُس چھوٹے سے خاندان کی مزے میں گذر ہونے لگی کہ اچانک ایک حادثہ پیش آگیا۔ ایک دن زینب ہر روز کی طرح منہ اندھیرے ضرورت سے فارغ ہونے کے لیے نکلی۔ اس دن وہ آبادی سے ذرا دُور چلی گئی۔ وہاں ایک زہریلے سانپ نے اُسے ڈس لیا۔ گاوں کے وید نے منتر پڑھے اور دوائیں بھی دیں، زینب بچ نہ سکی۔ شیخ عبداللہ نے آس پاس کے گاوں کے مسلمانوں میں اطلاع کروادی۔ آٹھ دس مرد اکھٹا ہوے۔ نمازِ جنازہ پڑھای گئی۔ گاوں سے لگی ہوی ایک سرکاری زمین میں قبر کھدوای گئی تھی۔ جب دفنانے کا وقت آیا تو کہیں سے ایک بقال آدھمکا، اُس نے کہا :

''ہمارے گاوں میں ابھی تک کسی کو دفنایا نہیں گیا ہے۔ ہم تو اپنے مُردوں کو ندی کے کنارے کاڑھ لگا کر جلاتے ہیں۔ یہ لوگ چاہیں تو اپنا مرگھٹ ندی کے اُس پار بنا سکتے ہیں۔''

''یہاں دفنانے کا مطلب ہے کہ یہ ترکوڑوں کا قبرستان بن جائے گا۔'' ایک اور ہندو نے حامی بھری۔

گاوں کے چند اور لوگ جمع ہوگئے۔ ایک ایاوار جو سوامی کہلاتا تھا وہ بھی آگیا۔ آخر میں بات وطن دار تک پہنچی۔ اُس نے سوامی کو بلا کر بات کی۔ سوامی نے واپس آکر کہا :

''ہر مذہب کا ایک دھرم ہوتا ہے۔ ترکوڑوں کو دھرم کے مطابق اُن کے مردوں کو دفنایا جاتا ہے۔ یہ زمین نظام علی شاہ کی ہے، کسی کی ذاتی ملکیت نہیں، اس زمین پر سب کا حق ہے۔ زندوں کے ساتھ تو حق تلفی کی جاسکتی ہے لیکن مُردوں کا حق ہم پر فرض ہے۔ بڑے دورانے یہاں دفنانے کی اجازت دے

دی ہے۔''

یہ سن کر گاؤں کے بہت سے لوگ وہاں سے چلے گئے۔ چند دھنگر، چند کسان اور چند دھوبی جو شیخ عبداللہ کے ساتھ کام کرتے تھے رُکے رہے۔ قریب کے گاؤں سے آے ہوے مسلمانوں نے مل کر قبر کو مٹی دی۔ دھوبیوں نے قبر پاٹ دی، پھر فاتحہ پڑھی گئی۔

شیخ عبداللہ کو تین سال تک کوی اولاد نہ ہوی۔ اس عرصے میں اُس کے پاس دو سے چار ایکڑ زمین ہوگئی اور جانوروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔ غلہ بہت آتا تھا، کھانے والے کم تھے۔ حلیمہ نے شیخ عبداللہ کی دوسری شادی کرڈالی۔ نکاح کی رات پہلی بیوی اپنی نند کے گلے پڑ کر بہت روی۔ نند نے دلاسا دیا۔

دوسری شادی کے ایک سال کے اندر حلیمہ کی مراد پوری ہوی چھوٹی بھابی کو ایک لڑکا ہوا۔ پٹھانوں جیسا لگتا تھا۔ اگلے سال اسی کو ایک لڑکی بھی ہوی۔ تیسرے سال پہلی بیوی کو اولاد ہوی تو اُس نے متواتر ہر سال ایک بچے کو جنم دیا۔ چند برس میں شیخ عبداللہ کے گھر میں تین لڑکے اور چار لڑکیاں کھیلنے لگ گئے۔ اولاد میں اضافے کے ساتھ جائیداد بھی بڑھتی گئی۔ مکان بھی لمبا چوڑا بنوالیا گیا۔ چار کمرے، دالان جس میں شیخ عبداللہ کے بیٹھنے کے لیے ایک بڑی کرسی، چار چھوٹی کرسیاں، لکڑی کا ایک تخت جس پر چادر بچھی ہوی۔ دالان کے دروازے پر ٹاٹ کا بڑا پردہ لٹکا ہوا۔ پھر پیش دالان، سامنے صدر دروازہ، پشت میں باورچی خانہ، ایک باؤلی، ذرا فاصلے پر پچھواڑے میں بیت الخلاء۔ پچھواڑے میں برسات کے موسم میں مکئی بوی جاتی اور فصل آنے پر جس بچے کا جب جی چاہتا بھٹے توڑ لاتا اور کوئلوں کی آگ پر بھن بھن کر کھاتا۔ بڑھتے ہوے معاشی حالات کے ساتھ گاؤں میں شیخ عبداللہ کا اقتدار بھی بڑھتا گیا۔ اُس کی شرافت اور دیانت داری کی وجہ سے گاؤں کے لوگ اُس کی خوب عزت کرتے، پنچایتوں میں اُسے بلایا جاتا۔ وہ اور اُس کے خاندان کا ہر فرد تلگو ایسے ہی بولتا جیسے اُس کی مادری زبان ہو۔ پنچایتوں میں شامل ہونے والوں میں اُس کا ایک اہم مقام ہوتا اور اگر فریقین میں مصالحت نہ ہوسکتی تو پنچوں کے ساتھ مل کر فیصلہ صادر کرنے میں اُس کی بات مان لی جاتی۔

گاؤں کے لوگوں میں ہر طرح سے گھل مل جانے کے باوجود شیخ عبداللہ کا طور طریق اور رہن سہن ذرا مختلف ہی رہا۔ وہ کبھی اپنا لباس نہیں بدلا، بچے تو پاجامے ہی پہنتے، لڑکیاں چوڑی دار پاجامے یا شلوار کے ساتھ شرٹ پہنتیں۔ خود شیخ عبداللہ شلوار اور شرٹ ہی پہنتا۔ کھیتوں پر جاتے ہوے وہ اپنا طپنچہ دائیں پاؤں کی پنڈلی میں باندھ لیتا۔ ایک چھوٹا سا خنجر ہمیشہ اُس کی کمر میں لٹکا رہتا۔ رمضان کے مہینے میں

پورے روزے رکھنا، جمعہ اور عیدین کی نماز پڑھنے کے لیے قریب کے گاؤں جانا اس کا معمول تھا۔ مرد بچے ذرا بڑے ہوئے تو اُنھیں بھی بیل بنڈی میں اپنے ساتھ لے جاتا۔ اُس کی بہن جواب مرحوم ہو چکی تھی ہر سال شب برأت کو چراغاں کرتی ۔ کدو کا دالچہ، ترکاری ملا گوشت، بگھارا کھانا ہوتا۔ میٹھا کھانا ضرور پکتا، فاتحہ دی جاتی۔ مرد بچے دائیں بائیں ہاتھ اُٹھا کر باپ کے پہلو میں دُعا کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ دوسری صبح شیخ عبداللہ اپنی بھانجی کی قبر پر فاتحہ پڑھ آتا۔ بہن کی موت کے بعد اب وہاں دو قبریں بن گئی تھیں۔ فاتحہ پڑھنے کے لیے بچے بھی ساتھ میں ہوتے۔ اُنھیں قرآن کی چند آیتیں اور دُعائیں سکھا دی گئی تھیں، گاؤں میں کوی مدرسہ نہ ہونے کی وجہ اُن کی باقاعدہ پڑھای نہ ہو سکی، ہر صبح گاؤں کے دیول کا پجاری دیول سے لگے چبوترے پر بیٹھ جاتا، جو بچے وہاں آتے انھیں وہ تلگو پڑھاتا، ویمنا، پوتنا اور تکنا کے اشعار بچوں کو یاد دلاے جاتے۔ شیخ عبداللہ کے لڑکوں نے اُسی سے شدھ بدھ تلگو پڑھنا سیکھ لیا تھا، ویمنا کے چند شعر بھی انھوں نے یاد کر لیے۔ زراعت کے کام میں باپ کا ہاتھ بھی بٹانے لگے۔

بچے جب بڑے ہو گئے تو شیخ عبداللہ نے ایک لڑکے اور دو لڑکیوں کی شادیاں کر ڈالیں۔ پھر اُس نے آہستہ آہستہ کھیتی باڑی کا کام کم کر دیا۔ اُس کا زیادہ وقت گاؤں کے لوگوں کے مسائل سلجھانے میں لگ جاتا، صرف زراعت کے اہم کام جیسے بیج بونا، کھیتوں میں پانی کی سیرابی اور فصل کٹوانا اُس کی نگرانی میں ہوتے۔

ربی کی فصل کے کاشت کے دن تھے، انباری پیٹھ کی آدھی دھن مڑی میں دھان بویا جا چکا تھا، باقی آدھی کے لیے دھان کا نار لگنا تھا، شیخ عبداللہ نے دھان کو بھگو کر بانس کے بڑے بڑے ٹوکروں میں رکھوا کر انھیں ٹاٹ سے باندھ دیا تھا، دو دن بعد مولکا پھوٹے ہوے دھان کو دھن مڑی میں پھیلانا تھا۔ ایک دن قبل انباری پیٹھ کے نیرٹی نے شیخ عبداللہ کو اطلاع دی کہ اس کا پڑوسی کسان راتوں میں چوری سے سارا پانی اپنی دھن مڑیوں میں کر لے رہا ہے۔ خود شیخ عبداللہ کی دھن مڑیاں سوکھ رہی ہیں، اُسی وقت شیخ عبداللہ نے انباری پیٹھ پہنچ کر پڑوسی کسان کو وارننگ دی : ''پانی کی چوری ہوگی تو اس بار تمہارا برا حشر ہوگا۔ اس سے پہلے بھی تم نے میری دھن مڑی کو سکھا دیا تھا۔ اب میں برداشت نہیں کروں گا۔''

دو دن بعد مولکے کے دھان اور نار کے ٹوکروں کو موٹ☆ گاڑی میں رکھوا کر شیخ عبداللہ اپنی زمین پر

☆ شمالی ہند میں چھوٹی بیل گاڑیوں کو ڈمنی (فرحت اللہ بیگ) کہتے ہیں۔ حیدرآباد ریاست کے تلنگانہ علاقے میں اسے سواری کی بنڈی بھی کہتے ہیں اور سامان سے لدی جانے والی یا زیادہ سواریوں والی گاڑی کو کھاچر یا موٹ گاڑی کہتے ہیں۔ اب سواری کی بیل بنڈیاں مفقود ہو چکی ہیں۔

پہنچا۔ تو اسے دُور ہی سے اپنی دھن مڑیاں سوکھی نظر آ ئیں ۔ آگے بڑھنے پر دو آدمی دھن مڑیوں کے بیچ والے نیم کے درخت کے نیچے بیٹھے دکھائی دیے۔ دونوں سینِدھی کا نشہ کر رہے تھے۔ نیم کے درخت کی ایک شاخ پر ایک رائفل لٹکی ہوئی تھی۔ ذرا قریب پہنچا تو اس کی اپنی دھن مڑیاں سوکھی نظر آئیں وہ نیم کے درخت کی طرف آگے بڑھنے لگا۔ اسے قریب آتا دیکھ کر درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں میں سے ایک نے اُٹھ کر درخت سے لٹکی ہوئی رائفل ہاتھ میں لے لی۔ یہ آدمی انباری پیٹھ کے کولیوں میں سے ایک تھا۔ پہلے برٹش انڈین فوج میں مامور تھا اور برما کے محاذ پر جا چکا تھا۔ شیخ عبداللہ کو آگے بڑھتا دیکھ کر اُس کے کانوں میں سیٹی سی بجی اور اس نے رائفل عبداللہ کی طرف تان لی، بڑوسی کسان نے سوچا تھا کہ سپاہی کی وضع قطع اور رائفل دیکھ کر بوڑھا عبداللہ واپس ہو جائے گا۔ گو شیخ عبداللہ کسی ملٹری کا ٹریننگ یافتہ نہیں تھا، لیکن بچپن میں اس کے دادا نے پہلوانی کے چند گر سکھا دیے تھے، فن سپہ گری اُس کی نس نس میں بھری تھی، کوئی چالیس پچاس سال کے بعد اُس نے ایک رائفل اپنے دُشمن کے ہاتھ میں دیکھی۔ اُس نے محسوس کیا کہ اُسے ایک بار پھر اپنی زمین سے بے دخل کیا جا رہا ہے۔ اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ عقاب کی طرح جھپٹ کر اس نے دُشمن کے ہاتھ پر پنجہ مارا۔ ہاتھ سے چھوٹتی ہوئی رائفل سے گولی نکل پڑی۔ درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے کسان کی ایک دردناک چیخ فضا میں گونجی۔ گولی اُس کے جسم کے آر پار ہو چکی تھی، عبداللہ کی نظریں خون میں لت پت زمیں پر اوندھے پڑے ہوئے کسان میں زندگی تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھیں کہ فوجی نے اُسے دھکا دے کر زمین پر پٹخ دیا، پھر اُسے چت کرتے ہوئے اُس کے سینے پر بیٹھ گیا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے عبداللہ کا گلا دبوچنے کی کوشش کرنے لگا۔ عبداللہ نے پھرتی سے کروٹ بدلی، کمر سے خنجر نکالا اور دُشمن کے سینے میں گھونپ دیا۔ خنجر پھسل گیا اور دائیں پسلی میں دھنس گیا، دُشمن کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اُس کی نظریں زمین پر پڑی ہوئی رائفل کی طرف تھیں۔ فوراً اُسے حاصل کرنے کی کوشش میں وہ لڑھکتا ہوا رائفل کی طرف کھسکنے لگا، اُس کے ہاتھ ابھی رائفل تک پہنچ نہیں پائے تھے کہ عبداللہ نے اپنی پنڈلی سے طپنچہ نکالا اور پلک جھپکنے میں اُس کی کنپٹی پر رکھ کر داغ دیا۔

دوہرے خون کے بعد شیخ عبداللہ آگے بڑھنا چاہتا تھا لیکن اُسے اپنے پاؤں کے نیچے کی زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ اپنے پاؤں جیسے زمین پر نہیں کہیں اور رکھ رہا تھا، لیکن اُس نے فیصلہ کر لیا کہ اُسے اب کہیں اور نہیں جانا ہے، وہ کہیں نہیں بھاگے گا۔ آہستہ آہستہ وہ اپنی بیل گاڑی کی طرف چلنے لگا،

گاڑی بان عبداللہ کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھ کر ہیبت میں وہاں سے بھاگ نکلا اور گھن پور پہنچ کر ہی دَم لیا، اپنی جھونپڑی میں داخل ہو کر وہ ایک کونے میں دبک کر بیٹھا رہا۔ اُس کی عورت جب باہر سے آئی اور اپنے شوہر کو اس طرح بیٹھا دیکھا تو اس نے سوالات کی بوچھار کر دی۔ ''اتنی جلدی کیوں واپس آگیا اور کیوں چپ ہے؟ مولکا بونے کا کام کیا ہوا؟ دورا کہاں ہے؟'' دیر تک کچھ نہ بولا تو وہ اپنے شوہر کو جھنجوڑنے لگی۔ راجیا کو اپنے پر قابو پانے اور زبان کھولنے میں بڑی دیر لگی۔ آہستہ آہستہ اُس نے سارا قصہ بیان کر دیا۔ پورا واقعہ سن کر وہ اپنے بھائی کی جھونپڑی کی طرف بھاگی۔ تھوڑی دیر میں بات گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔

شیخ عبداللہ نے جب دیکھا کہ راجیا خوف سے بھاگ گیا ہے تو خود اس نے گاڑی پر بیٹھ کر بیلوں کے پگے سنبھالے۔ انھیں گھن پور کے رُخ پر پلٹایا۔ گاڑی کے اگلے حصے پر بیٹھے ہوئے اس نے اپنے اُوپر رومال اس طرح سے اوڑھ لیا کہ اس کے لباس پر جو خون کے دھبے تھے وہ کسی کو نظر نہ آسکیں۔ آگے بڑھنے کے لیے اس نے دونوں بیلوں کے چوتڑوں پر کیل والی لکڑی چبھودی۔ بیلوں نے کیل کی چبھن کو محسوس کیا۔ اُنھیں شاید یہ بھی احساس ہو گیا تھا کہ آج اُن کا مالک اُنھیں ہانک رہا ہے اور اس کے تیور بدلے بدلے سے ہیں۔ بیلوں نے تھوڑی دیر قبل ہی رائفل اور طمنچے کی آوازیں سنی تھی۔ آوازیں تو ان کو یاد نہ رہی ہوں لیکن اندر سے کچھ ہلچل سی تھی۔ انھوں نے چلنے اور دوڑنے میں پھرتی دکھائی۔ کم وقت میں طے کیا جانے والا گھر کا راستہ آدھے وقت میں طے کر لیا۔

اُدھر دھن مڑی کے آس پاس کام کرنے والے کسانوں اور تاڑی تاسنے والوں نے رائفل کی آواز سنی تھی۔ دو تین آدمی آواز پر نیم کے درخت کی طرف دوڑے دوڑے آئے۔ انھوں نے دو لاشوں کو درخت کے نیچے خون میں لت پت پایا۔ تھوڑی دیر میں چند مرد اور عورتیں وہاں اکٹھا ہو گئے۔ مرنے والوں کے خاندان کی عورتیں اور بچے بھی روتے پلاتے پہنچ گئے۔

اس منظر کو لوگ زیادہ دیر تک دیکھ نہ سکے، کسی نے نعشوں پر کپڑے ڈھانک دیے۔ پہلے آنے والوں میں دو آدمی تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے انباری پیٹھ کی طرف روانہ ہو گئے، راستہ میں ایک نے دوسرے سے کہا:

''میں جانتا تھا کہ آج کچھ ہونے والا ہے، ملنا کو اپنی رائفل پر بڑا گھمنڈ تھا۔''

اس پر کسی ردِّ عمل کا اظہار نہ کرتے ہوئے دوسرے نے کہا:

''پدّادورا کے پاس ہمیں جلدی پہنچنا چاہیے۔''

انباری پیٹھ کے وطن دار سے جب وہ دونوں ملے تو اس نے فوراً گاوں کے پولیس پٹیل کو بلوا کر چند ہدایتیں دیں۔ شام تک پولیس کا امین دو کانسٹبلوں کو لے کر انباری پیٹھ پہنچ گیا۔ اس نے پہلے وطن دار سے ملاقات کی۔ اُن دونوں گواہوں کو بلوایا جنھوں نے سب سے پہلے لاشوں کو دیکھا تھا۔ پھر گاوں کے مزید دو معتبر کسانوں کو لے کر وہ موقع واردات پر پہنچ گیا۔ پنچ نامہ کیا، گواہوں کے انگوٹھوں کے نشان پنچ نامے پر لیے۔ رائفل اور دوسرے ثبوتوں کو اپنی تحویل میں کرلیا اور لاشوں کو ان کے خاندانوں کے حوالے کیا۔

جوں ہی شیخ عبداللہ گھن پور پہنچا بیل بنڈی کی آواز سن کر گھر کے چھوٹے بچے باہر نکل آے اور شور مچانے لگے۔

''داداحضت آگئے، داداحضت آگئے۔''

آواز سن کر گھر کی عورتیں بھی شیخ عبداللہ کے بے وقت آنے پر دروازے تک پہنچ گئیں۔ ان کی طرف دیکھے بغیر رومال کو اپنے اُوپر ڈھانکتے ہوے شیخ عبداللہ گھر میں داخل ہوگیا۔

کسی طرح ان کی بڑی بہو کی نظر ان کے کرتے کے دامن پر گرے خون کے دھبوں پر پڑی ''باوا جان کے کپڑوں پر خون کے دھبے ہیں'' بہو نے اونچی آواز میں اعلان کیا تو گھر کی باقی عورتیں شیخ عبداللہ کے قریب آگئیں اور اُنھیں سر سے پاؤں تک دیکھنے لگیں۔

''مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ میں نے اُسے قتل کردیا ہے۔ سالے نے میری دھن مڑی کا سارا پانی چرالیا تھا۔ اب اس سال کی فصل بھی نہیں ہوگی۔ وہ میری زمین چھین لینا چاہتا تھا۔'' یہ سن کر عورتوں پر سکتہ طاری ہوگیا۔

گاوں میں بیل بنڈی کے ساتھ شیخ عبداللہ کو داخل ہوتے ہوے چند لوگوں نے دیکھ لیا تھا۔ جن گھرانوں میں قتل کی اطلاع ہوچکی تھی وہاں کانا پھوسی ہونے لگی۔ بات وطن دار کے کان پر پڑی تو اُس نے اپنے دو آدمیوں کو عبداللہ کے گھر بھیجا کہ اصل واقعے کا پتہ لگایا۔ چند اور لوگ بھی گھر کے سامنے جمع ہوگئے۔ گھر کے نوکر نے بیل بنڈی کو وہاں سے نکال لیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ کھٹکا دے کر دروازہ کھلوائے۔ تھوڑی دیر بعد نہا دھو کر شیخ عبداللہ دالان میں آکر کرسی پر بیٹھ گیا اور باہر کا دروازہ کھلوا دیا۔ پہلے وطن دار کے دو آدمی آہستہ آہستہ مکان کے اندر داخل ہوے اور شیخ عبداللہ کی کرسی

کے سامنے چبوترے پر بیٹھ گئے۔ پھر دیر تک اُنھوں نے ہمدردی کی باتیں کیں۔ اسی دوران شیخ عبداللہ کا وہ دھنگر دوست بھی پہنچ گیا جس نے پہلی بار گاوں میں داخل ہونے پر شیخ عبداللہ کو پناہ دی تھی۔ آتے ہی وہ کہنے لگا :

''انیا، تم نے تو گولی نہیں چلائی ہے۔ رائفل بھی اُس کولی ملنا کی تھی۔ وہ تو تمھیں مارڈالنے آیا تھا۔ تم نے اپنا بچاؤ کیا۔ گولی جب چلی تو بندوق اُسی کے ہاتھ میں تھی۔ گولی چلی اور رامیا کسان ڈھیر ہوگیا تو وہ حرامی، کولی ملنا نے تم کو زمین پر گرا کر چت کر دیا۔ وہ تمہارا گلا دبا کر مار ڈالنا چاہتا تھا۔ پھر تم نے اپنی طاقت سے اُس پر قابو پالیا۔ اگر تم اُسے مار نہ ڈالتے تو وہ تمہاری جان لے لیتا۔ سالے پر تاڑی کا نشہ خوب چڑھ گیا تھا۔ سالا مرغی کی ایک ٹانگ بھی نہ کھا سکا۔''

''یہ ساری باتیں تمھیں کس نے بتائیں؟'' شیخ عبداللہ نے بڑے صبر وسکون سے سوال کیا۔

''اور کون بتاتا؟ راجیا نے، وہی تو اکیلا تھا وہاں۔''

''تب تو ہمارا انا بے قصور ہے۔'' وطن دار کے دو آدمیوں میں سے ایک نے کہا۔ پھر دونوں وہاں سے چلے گئے۔

گاوں کے کچھ اور بھی لوگ آئے۔ شیخ عبداللہ کی دوستی سب سے تھی۔ سب نے اپنی ہمدردی جتائی۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ لوگ بھی چلے گئے۔ شام ہونے کو آئی۔ کسی نے رپورٹ دی کہ پولیس کے کچھ لوگ انباری پیٹھ آئے ہیں۔ موقع واردات پر پہنچ کر پنچ نامہ بھی کیا ہے۔ رائفل اور دوسری شہادتوں کو اپنی تحویل میں کرلیا ہے اور انھیں ٹاٹ کے تھیلوں میں باندھ کر رکھا ہے۔

سب لوگ جا چکے اور دھنگر اکیلا رہ گیا تو شیخ عبداللہ نے گھر والوں سے شام کا کھانا لگانے کے لیے کہا۔ کھانا لگ چکا تو اپنے بڑے بیٹے کو پاس بلایا۔

''دیکھو اگھن پور میں شاید یہ میرا آخری کھانا ہوگا۔ یہ کھانا میں تمہارے کاکا کے ساتھ کھاؤں گا۔ تم جانتے ہو کہ اسی کاکا نے چالیس پینتالیس سال پہلے مجھے اپنے گھر میں سہارا دیا تھا۔ اب یہاں پولیس کبھی بھی آسکتی ہے۔ میں اُن کے ساتھ اکیلا جاؤں گا۔ کسی کو میرے ساتھ آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری فکر نہ کرنا۔ اپنے اپنے کام پر لگ جانا۔ ایک نہ ایک دن میں واپس آجاؤں گا۔''

دونوں دوست کھانا کھا چکے تو عبداللہ نے دھنگر کو رخصت کر دیا اور خود اپنی کرسی پر بیٹھ کر پولیس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر نہ ہوی تھی کہ ایک بیل بنڈی عبداللہ کے گھر کے سامنے آ کر رُکی۔ بنڈی سے پولیس کا امین اُتر پڑا۔ اُس کے ساتھ دو کانسٹبل اور انباری پیٹھ کے دو اور آدمی بھی تھے۔ گاڑی کی آمد پر عبداللہ گھر سے باہر آیا۔ امین کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوے اُس نے کہا :

''امین صاحب میں ہی شیخ عبداللہ ہوں۔ تشریف لائیے۔ میں آپ کا انتظار کر رہا تھا۔''

امین نے بھی دوستانہ لہجے میں کہا :

''میرے پاس تمہاری گرفتاری کا وارنٹ تو نہیں ہے۔ لیکن چوں کہ تم پر قتل کا الزام ہے اس لیے اب تم میری حراست میں ہو۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔''

''میں آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن آپ لوگ دن بھر کے تھکے ماندے ہیں۔ رات کا کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا، کھانا تیار ہے۔ ایک اور بیل گاڑی کا بھی انتظام کر دیا ہے اور ہاں کھانے سے قبل آپ اُس آدمی کا بھی بیان قلم بند کرلیں جو اس واقعے کا چشم دید گواہ ہے۔ اُسے میں ابھی بلواتا ہوں۔

شیخ عبداللہ نے جس طرح اپنا تعارف کروایا تھا امین اُسی سے متاثر تھا۔ اُس کی باتوں نے اُسے اور بھی شیخ عبداللہ کا گرویدہ کر دیا۔ اُسے یقین ہوگیا کہ شیخ عبداللہ بھاگنے والے لوگوں میں سے نہیں ہے۔ راجیا آگیا تو پہلے اُس کا بیان قلم بند ہوا۔ پولیس کے امین نے اُس سے صرف اتنا کہا کہ جو واقعہ اُس کی آنکھوں کے سامنے گذرا ہے وہ اُسے بیان کر دے۔ راجیا کہنے لگا تو امین نے لکھا۔

''جب ہم دھن مڑی کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ پانی نہ ہونے سے پوری دھن مڑی سوکھ گئی ہے۔ دو آدمی نیم کے درخت کے نیچے بیٹھے سیندھی پی رہے ہیں۔ درخت سے ایک بندوق لٹکی ہوی ہے۔ جوں ہی دورا بنڈی سے اُتر کر اُن لوگوں کی طرف جانے لگا تو ایک آدمی بندوق ہاتھ میں لے کر دورا کو مارنے آگے بڑھا۔ دورا اُس کی طرف جھپٹ پڑا تو رائفل سے گولی چل گئی۔ دوسرا آدمی جو درخت کے نیچے بیٹھا ابھی سیندھی حلق سے اُتار رہا تھا چیخا اور اُلٹ کر گر پڑا، اُس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ گولی کی آواز سن کر بیل اچھلنے لگ گئے تھے میں اُنھیں سنبھال رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک چھوٹی بندوق کے چلنے کی آواز آئی، بیلوں کو قابو میں کرنے کے بعد میں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو اُس وقت وہ چھوٹی بندوق دورا کے ہاتھ میں تھی اور وہ میری طرف آرہا تھا۔ میں وہاں سے فوراً بھاگ نکلا اور گاؤں پہنچ کر اپنی جھونپڑی میں گھس گیا۔ اُس وقت سے اب تک میں جھونپڑی سے باہر نہیں نکلا۔''

بیان ختم ہوا تو امین نے اُس کے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کا نشان لیا اور کاغذ پر اپنے دستخط کرتے ہوئے اُسے محفوظ کر لیا۔

اس عرصے میں کھانا لگایا جا چکا تھا، امین کے لیے دالان میں تخت پر انتظام تھا۔ باقی لوگوں کے لیے پیش دالان میں فرش بچھا دیا گیا تھا۔ امین نے کھانے کا لقمہ اُٹھاتے ہوئے شیخ عبداللہ سے کہا :

'' میں تم سے زیادہ سوالات نہیں کروں گا۔ پنچ نامہ تو ہو چکا اور گواہوں کے بیانات بھی قلم بند ہوئے لیکن ایک بار میں تم سے تفصیلات سن لینا چاہتا ہوں۔ تمہارا بیان تو کچہری پہنچ کر لیا جائے گا۔

شیخ عبداللہ نے گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے واقعات کی تفصیل سنانی شروع کی تو اُس کے کھانا ختم کرنے سے قبل سارے واقعات بیان کر دیے۔

'' مجھے اُمید ہے کہ تم بری کر دیے جاؤ گے۔ تم نے جو کچھ کیا وہ حق حفاظتِ خود اختیاری میں کیا ہے ورنہ وہ کولی تمھیں جان سے مار ڈالتا۔'' کھانا ختم کر کے پانی کا گلاس ہاتھ میں لیتے ہوئے امین نے کہا :

'' نتیجہ جو کچھ ہوگا امین صاحب مجھے اُس کی پرواہ نہیں ہے۔ میری آدھی زمین تو پہلے ناقابل کاشت تھی، وہ پرم پو گو تھی، میں نے اُسے بڑی محنت سے قابل کاشت بنایا۔ چار پانچ سال سے کھاد دے کر ساری زمین زرخیز بنالی۔ میں اُس کی تحصیل دیتا ہوں۔ سالا مجھ سے حسد کرنے لگا تھا اور کسی طرح وہ زمین مجھ سے ہتیا لینا چاہتا تھا۔ میری زمین سے مجھے بے دخل کرنا چاہتا تھا۔ میں یہ برداشت نہ کر سکا۔ رائفل دیکھ کر ہی میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ میں نے یہ قتل کیا ہے۔ چاہے اُسے لوگ کوئی نام دیں۔''
یہ کہتے ہوئے شیخ عبداللہ کی سانس تیز چلنے لگ گئی تھی۔ اُس نے رُک کر امین کی طرف دیکھا۔ پھر کہنے لگا :

'' اب ایک گذارش ہے آپ سے۔ رات بہت ہو چکی ہے۔ آپ لوگوں کے سونے کا انتظام ہو جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ فجر کی نماز اپنے گھر میں پڑھ لوں۔ اس کے ساتھ ہم لوگ روانہ ہو جائیں گے۔ میں کپڑوں کی وہ گٹھڑی بھی ساتھ لے رہا ہوں جن پر خون کے دھبے ہیں۔''

'' ہاں! عبداللہ اُس کے ساتھ وہ طپنچہ اور وہ خنجر بھی لے لینا جن سے اُس کولی کا خون ہوا ہے۔''
امین نے کہا۔

شیخ عبداللہ امین کی یہ بات سن کر فوراً گھر کے اندر گیا۔ خنجر، طپنچہ اور کپڑوں کی گٹھڑی لے کر باہر آیا۔ اُنھیں ایک کپڑے میں باندھ کر امین کے حوالے کر دیا۔

فجر کے ساتھ جب یہ چھوٹا سا قافلہ روانہ ہونے لگا تو امین نے شیخ عبداللہ سے کہا :

''گھر والوں سے کہہ دینا کہ اپنا اپنا خیال رکھیں ۔ چند دن تک کوی گھر سے باہر تنہا نہ جاے تو اچھا ہے۔''

''امین صاحب مجھے پورا بھروسہ ہے کہ سارا گاوں میرے کنبے کی حفاظت کرے گا۔'' شیخ عبداللہ نے جواب دیا۔

دونوں بیل گاڑیاں جب چلنے لگیں تو شیخ عبداللہ کو یاد آیا کہ کوی چالیس، پینتالیس سال قبل بڑے ہی خوف و ہراس میں اُس نے دہلی کو چھوڑا تھا۔ انگریزوں کو بھنک پڑتی تو وہ اُسی وقت بہن اور بھانجی کے ساتھ مارڈال دیا جاتا۔ اب تو وہ اپنے پیچھے پورے کنبے کو چھوڑ جارہا ہے۔ پولیس کا دستہ اُس کی حفاظت کررہا ہے

اسی دن سہ پہر کے قریب دونوں بیل گاڑیاں جگتیال میں پولیس کچہری کے سامنے رُکیں ۔ شیخ عبداللہ کو لاک اپ میں رکھ کر پولیس کا امین مقامی تحصیل دار کے دفتر گیا جو ان دنوں فوجداری مقدمات کے لیے عدالت کچہری منصفی بھی کہلاتا تھا۔ تحصیلدار نے شیخ عبداللہ کے نام وارنٹ جاری کرتے ہوے اُسے دوسرے دن عدالت میں پیش کرنے کو کہا۔ دوسرے دن جب مقدمہ پیش ہوا تو تحصیل دار نے منصف مجسٹریٹ کی حیثیت سے ملزم کو عدالت کچہری ضلع کریم نگر کے سامنے پیش کرنے اور مقدمے کو اُسی عدالت کے سپرد کرنے کے احکام جاری کردیے۔

عدالت کچہری ضلع کریم نگر میں اوّل تعلق دار نے ضلع مجسٹریٹ کی حیثیت سے دو مہینوں تک مقدمے کی سماعت کی ۔ چوں کہ سارے گواہ ہندو تھے اس لیے شاستر اُن کے ہاتھ میں دے کر اُن سے حلف لیے گئے اور اُن کے بیانات قلم بند کیے گئے ۔ شاہی وکیل نے استدلال پیش کیا کہ ملزم نے قتل عمد کا ارتکاب کیا ہے۔ جب گولی چلی تو رائفل کس کے ہاتھ میں تھی اس بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ شیخ عبداللہ، ملنا کولی پر جھپٹ پڑا تھا جس کی وجہ سے گولی چلی اور وہ کسان مارا گیا۔ پھر شیخ نے ملنا کو پہلے اپنے خنجر سے زخمی کیا اس کے بعد اپنا طپنچہ اس کی کنپٹی میں داغ دیا۔ اس مقدمے میں کسی چشم دید گواہ کی ضرورت نہیں ہے۔ قرائن سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ شیخ عبداللہ نے عمداً یہ قتل کیا ہے۔ اس قتل میں ملزم کا ارادہ شامل ہے وہ ہتھیار بھی ثبوت میں پیش کردیے گئے ہیں جن سے یہ دونوں قتل واقع ہوے ہیں۔ اس لیے انصاف کا تقاضہ ہے کہ ملزم کو پھانسی کی سزا دی جاے۔

اس کے بعد عدالت کا حکم ہوا کہ شیخ عبداللہ اپنی صفای میں کچھ کہنا چاہے تو وہ اپنا بیان قلم بند کراے۔ قرآن شریف کا ایک نسخہ اُس کے ہاتھ میں پکڑا دیا گیا۔ قرآن ہاتھ میں لے کر شیخ عبداللہ کہنے لگا :

''حضورِ والا یقیناً یہ قتل میں نے اپنے ارادے سے کیا ہے۔ میں اپنی زمین میں دھان کا مولکا بونے کے لیے پہنچا تو میری نظر سوکھی ہوی دھن مڑی پر پڑی۔ پہلے ہی سے مجھے معلوم تھا کہ میرا پڑوسی کسان کسی نہ کسی بہانے سے میری زمین ہتیا لینا چاہتا ہے۔ کئی بار میں نے اُسے متنبہ کیا تھا۔ آخری بار میں نے اُسے دھمکی بھی دی کہ اگر وہ نہ مانا تو اُس کا حشر برا ہوگا۔ اب جو میں نے دیکھا کہ وہ ایک دوسرے آدمی کو ساتھ لایا ہے اور مجھے خوف و ہراس میں مبتلا کرنے کی غرض سے اُن لوگوں نے ایک رائفل بھی درخت پر لٹکا رکھی ہے تو رائفل پر نظر پڑتے ہی میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ مجھے خیال ہوا میرا پڑوسی میری زندگی میں نہیں تو مجھے مار کر زمین حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مجھے اور میرے بچوں کو اُس زمین سے بے دخل کرنا چاہتا ہے جو برسوں سے میری ہے اور جس پر میں فصل اُگاتا آیا ہوں۔ اس کے بعد میں نے فیصلہ کرلیا کہ اگر مجھے مرنا ہی ہے تو پہلے ان دونوں کا خاتمہ کردوں گا۔ اللہ نے میرا ساتھ دیا اور میں اس میں کامیاب ہوگیا۔''

مقدمے کی پوری کارروای کو قلم بند کرتے ہوے ضلع کی عدالت نے دوسرے دن فیصلہ سنایا :

''اس مقدمے میں یہی نہیں کہ ملزم نے اقبالِ جرم کیا ہے بلکہ گواہوں کے بیانات اور قرائن کی شہادتوں سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ملزم شیخ عبداللہ نے اپنے ارادے سے یہ قتل کیا ہے۔ لہٰذا ملزم شیخ عبداللہ کو پھانسی کی سزا دی جاتی ہے۔ شیخ عبداللہ کے گلے میں پھانسی کا پھندہ اُس وقت تک رہے جب تک کہ اُس کی موت واقع نہیں ہوتی۔''

اس فیصلے کے بعد شیخ عبداللہ کو کچھ دن تک کریم نگر کی جیل میں رکھا گیا۔ فیصلے کو عدالت عالیہ کی توثیق کے لیے حیدرآباد بھیجا گیا۔ عدالت عالیہ کی توثیق کے احکام پر مفتیٔ وقت نے بھی اپنے دستخط ثبت کردیے۔ پھر یہ فائل صدر اعظم کے پاس بھیجی گئی۔ آخری بار جب یہ اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں آصف سادس کے پاس پہنچی تو اُس پر درج تھا۔ بہ ملاحظہ : عرض داشت صیغۂ عدالت مروجہ فلاں فلاں ھ مطابق فلاں فلاں ء اس کے نیچے لکھا تھا۔

حوالہ : بہ مرافعہ سرکارِ عالی بہ نام شیخ عبداللہ ملزم قتل عمد۔

اس پر آصف سادس نے اپنے احکام صادر کیے۔

''ملزم مذکور کو بجائے سزائے موت کے سزائے حبس دوام دی جاتی ہے۔

شرح دستخط و مہر .... میر محبوب علی خاں (یہ واقعہ ۱۸۹۹ء کے آخری زمانہ کا ہے)

اس حکم نامے کی نقل کریم نگر جیل بھیجی گئی۔ شیخ عبداللہ کو آصف سادس کا حکم سنایا گیا اور چند دنوں بعد اُسے حیدرآباد جیل منتقل کر دیا گیا۔ عمر قید کی سزا بیس سال کی تھی جو قیدی کے نیک چلن کی بنیاد پر دس سال میں پوری ہو جاتی۔ جیل میں ابھی سات سال پورے نہیں ہوئے تھے کہ شیخ عبداللہ کو تین دن تک شدت کا بخار رہا۔ اس سے قبل کے اس کی بیماری کی اطلاع اس کی اولاد تک پہنچتی وہ رحلت کر گیا۔ وارثوں کی غیر موجودگی میں اُسے بعد نمازِ جنازہ جیل خانے کے احاطے میں موجود قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ اس واقعہ کی اطلاع پولیس کے ذریعہ کریم نگر اور جگتیال سے ہو کر گھن پور تک پہنچی تو کوئی تیس پینتیس دن ہو چکے تھے۔ گھر والے خوب روئے۔ چالیسواں کیا۔ اس کے تیسرے دن زیارت کی۔ پھر اگلی صبح سے شیخ عبداللہ کے تینوں لڑکے کھیتی باڑی کے کام میں پہلے کی طرح جٹ گئے۔

✠ ✠ ✠

ایک تھا چھبّو

شیخ داؤد کے انتقال پر اُس کے بڑے لڑکے شیخ مولا کو گھن پور کی پٹیل گری سونپی گئی۔ منجھلا لڑکا شیخ محبوب پولیس میں ملازم ہوا۔ گاوں کی کھیتی باڑی کی آزادانہ زندگی نصیب نہ ہوی تو چند ہی دن میں نوکری چھوڑ کر وہ گھن پور آرہا۔ اچھا ہوا کہ اُسے کوی اولاد نہ ہوی، ورنہ ورثہ کی جائیداد اتنی نہ تھی کہ وہ ہل چلا کر بیوی بچوں کا پیٹ پال سکتا۔ پڑوس کے گاوں تانیال کے وطن دار کو ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو اُس کے کھیتوں میں پانی کی سیرابی کا انتظام کرنے والے نیرٹیوں پر نگران ہو۔ ایک دن شیخ مولا نے اپنے بھای کا ذکر تانیال کے وطن دار سے کیا تو اُس نے سوچا سیری داری کے لیے اس سے اچھا اور کوی آدمی اُسے نہ ملے گا۔ ایک مسلمان اور وہ بھی پولیس کی نوکری کیا ہوا۔ شیخ محبوب کو یہ کام اس لیے بھا گیا کہ اس میں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی تھی۔ کھیتوں میں کام کرنے والوں پر داداگری بھی چل سکتی تھی۔ گھن پور میں تو بڑے بھای کی عمل داری تھی۔ خطاب یا عہدہ کتنا چھوٹا ہی سہی لیکن اُس کے آگے پیچھے نواب، جنگ، ملک، دولہ اور دار جیسے الفاظ ہوں تو عہدہ بارعب ہو جاتا ہے۔ ''سیری دار'' گویا وطن دار کے بعد اُسی کا نمبر تھا۔ اُسے معاوضہ سال میں دو بار اناج کی شکل میں ملتا جو کھینچ تان کر میاں بیوی کی ضرورتوں کو پورا کرتا تھا۔ اُس کے گھر میں ایک بکری اور چند مرغیاں ہمیشہ ہوتے۔ کپڑا، لتا اور گھر کا دوسرا سامان انھیں بیچ کر حاصل کیا جاتا۔

وطن دار نے شیخ محبوب کو اجازت دے رکھی تھی کہ وہ آبادی میں جہاں بھی خالی زمین پڑی ہے

ایک اچھی جھونپڑی ڈال لے۔ جب تک اُس کی نوکری رہے گی، اس جھونپڑی اور زمین پر اُسی کا قبضہ ہوگا۔ جب نوکری چھوڑ کر جانے لگے گا تو اپنے ساتھ جھونپڑی کا سارا سامان لے جاسکے گا۔ تانیال سے گھن پور جانے والے رُخ پر مشرق میں جہاں تانیال کی آبادی ختم ہوتی تھی، دو بیگھہ زمین مسطح تھی۔ اُسی پر شیخ محبوب نے اپنی جھونپڑی ڈال لی۔ جنگل کی لکڑی، تاڑ اور سیندھی کے پھڑوں کے کوی دام نہ تھے۔ مزدور گاوں کی رعایا میں سے تھے۔ شیخ محبوب کا کوی پیسہ خرچ نہ ہوا۔ جھونپڑی کی چھت تاڑ کے پھڑوں سے ڈھانک دی گئی۔ اطراف سیندھی کے پھڑوں کی باڑھ لگادی گئی اس طرح سے کہ نیم کا موجود پیڑ اُس کے گھیرے میں آگیا۔ جھونپڑی اور گھن پور کے درمیان اتنا کم فاصلہ تھا کہ شام ہونے اور مویشیوں کے اپنے اپنے ٹھکانے پر پہنچنے پر ایک اُونچی آواز دو تو وہ گھن پور کے مغرب میں بنے مکانات تک پہنچ جاتی۔ بیچ میں ایک چھوٹی سی ندی تھی جو صرف بارش کے موسم میں بہتی۔ کبھی ضرورت پڑتی تو شیخ مولا اپنے بھای کو آواز دے کر بلالیا کرتا۔

شیخ محبوب کی زندگی اپنی بیوی کے ساتھ ہنسی خوشی سے اسی جھونپڑی میں بسر ہونے لگی۔ تھوڑی بہت ترکاریاں گاوں سے مل جاتیں۔ گھر کے انڈے اور بکری کا دودھ ہوتا۔ کسی سال بارش کم ہوتی تو گاوں میں قحط کا ماحول ہوتا۔ کھانا تین بار کی جگہ دو بار پکتا۔ شیخ محبوب کی بیوی ان حالات میں بھی کسی طرح بکری کے چارہ میں کمی نہ ہونے دیتی۔ بکری کبھی ایک اور کبھی دو بچے دیتی۔ بکری کے بچے جب بڑے ہوجاتے تو اُنھیں بیچ دیا جاتا۔ بکری اور اُس کے بچوں سے کھیلنے کے لیے اکثر شیخ مولا کا چھوٹا لڑکا مجید تانیال آجاتا۔ کبھی کبھی بکری دودھ زیادہ دیتی تو مجید کی چچی زائد دودھ اُسے پلادیتی۔ مجید کی موجودگی میں چچی کا دل بھی بہل جاتا۔ اب کی بار بکری نے دو بچے دیے۔ ایک مادہ اور ایک نر۔ مجید سات آٹھ سال کا ہو چکا تھا۔ اس دفعہ وہ بکری کے بچوں سے کھیلنے آیا تو اُس نے نر بچے کو ہاتھوں میں اُٹھا کر اپنے چچا سے کہا :

''منجھلے ابا یہ چھیلہ میرا ہے۔ اسے میں دوسروں کو بیچنے نہیں دوں گا۔''

''اسے لے کر کیا کرے گا۔ یہ تو ابھی ماں کا دودھ پیتا ہے۔''

یہ سن کر مجید کو شبہ ہوا کہ شاید چچا اسے دینے سے انکار کردیں گے۔

''میں باوا جان سے کہہ کر اس کی قیمت دلادوں گا۔''

''تو کیا دلاے گا رے۔ تیرے باوا جان سے میں پیسے لے لوں گا۔ ویسے میں تیرے باوا کا قرض

دار بھی ہوں۔ چند برس پہلے تمہارے پینٹھ ☆ کی کھاد میں نے اپنے کھیت میں استعمال کر لی تھی، لیکن سن، اسے ذرا بڑا ہو جانے دے۔ ماں کا دودھ چھوڑے گا تو لے جانا۔''

''نہیں منجھلے ابا یہ تو رہے گا یہیں پر۔ ذرا بڑا ہو جائے گا تو میں اسے اپنے ساتھ رکھا کروں گا۔ یہ میرے ساتھ گھومے پھرے گا۔ میں اسے خوب کھلا پلا کر موٹا کروں گا۔ پھر رات میں لا کر یہیں پر باندھ دوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ آج سے یہ بکرا تیرا ہوا۔''

تین مہینوں کے اندر بکری نے اپنے بچوں کو دودھ پلانے سے اِنکار کر دیا۔ وہ اُن کے قریب تک جاتی۔ تھوڑی دیر ٹھیری رہتی۔ جب بچے اُس کے تھنوں پر منہ مارنے لگتے تو وہ اُچھل کر وہاں سے نکل جاتی اور کھیتوں کی راہ لیتی۔ بچے اُچھلتے کودتے تھوڑی دُور تک اُس کے ساتھ جاتے۔ کوی نہ کوی اُنھیں پکڑ کر واپس لاتا اور نیم کے پیڑ سے باندھ دیتا۔ مجید موجود ہوتا تو یہ کام وہی کرتا۔ کبھی کبھی یہ بچے بہت ستاتے، کبھی گھر کی ہانڈیوں میں منہ ڈال رہے ہیں، کبھی جھونپڑی کے اندر مینگنیاں کر رہے ہیں، کبھی اِدھر اُدھر بھاگ رہے ہیں۔ بھاگ بھاگ کر پکڑتے ہوے مجید مزے لیتا۔ کوی بچہ اُس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا اور پھر بھاگنے لگتا تو مجید بھی اُس کے پیچھے بھاگ کر اُسے پھر سے پکڑتا۔ اب وہ بچے بیری اور کیکر کے پتے کھانے لگ گئے تھے۔ تانیال آتے ہوے مجید راستے ہی سے بیری کے پتے توڑ لیتا اور کیکر کی چند چھوٹی چھوٹی ڈالیوں سمیت انھیں ایک ٹاٹ کے تھیلے میں باندھ کر اپنے کاندھے پر ڈال لیتا۔ چچا کے گھر پہنچ کر وہ انھیں بکری اور اُس کے بچوں کے سامنے ڈال دیتا۔ اُنھیں کھاتا ہوا دیکھتا۔ پھر بچوں کو بکری سے الگ کر کے اُن کے ساتھ کھیلتا۔ کبھی کبھی وہ اپنے ساتھ اناج کے دانے بھی لاتا۔ ابتدا میں تو اناج کے دانے بکری ہی کھا جاتی۔ اُس کے بچوں کے دانت ذرا مضبوط ہوے تو وہ بھی اناج شوق سے کھانے لگے۔ مجید نے نر بچے کا نام جھبو رکھ دیا اور اُسے جھبو نام کی آواز سے مانوس کر دیا۔ ایک دن اُس نے اپنے چچا سے کہا:

''منجھلے ابا اب جھبو میرا لاگو ہو گیا ہے۔ اب میں اسے ساتھ لے جایا کروں گا۔''

''ضرور لے جانا لیکن پہلے اپنے باوا جان سے اجازت لے لے۔''

''باوا جان نے کہا ہے کہ میں جو چاہے کروں لیکن مدرسے سے غیر حاضر نہ رہوں۔ مدرسے میں میری ایک بھی غیر حاضری نہیں ہے۔''

☆ جہاں مویشیوں کا گوبر یکجا کیا جاتا ہے اور جو بعد میں کھاد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

اب مجید ہر روز صبح صبح اپنے چچا کے گھر پہنچ جاتا۔ چھبو کو اپنے گھر لاتا۔ مختلف جھاڑیوں اور ترکاریوں کے پتے وہ پہلے ہی سے جمع کر رکھے ہوتا۔ ایک لگن میں پانی کے ساتھ اُنھیں صحن کے اُس کونے میں رکھ دیتا جہاں وہ چھبو کو باندھا کرتا۔

پہلے تو ایک آدھ دن وہ چھبو کو لے کر اسکول بھی گیا۔ لیکن اسکول کے تمام بچوں کی توجہ چھبو کی طرف ہونے لگی تو اُستاد کی ڈانٹ پر مجید اُسے لے کر فوراً گھر واپس ہو گیا۔ اس کے بعد مجید کا معمول ہو گیا کہ وہ اسکول سے چھوٹتے ہی گھر پہنچ کر چھبو کو ساتھ لیتا اور جنگل کی راہ لیتا۔ کبھی کبھی کوی دوسرا بچہ بھی اُس کے ساتھ ہوتا۔ گاوں سے چند فرلانگ پر ایک بڑ کا درخت تھا۔ اُس کی جڑیں دُور دُور تک پھیلیں ہوی تھیں اور ایک سے زائد پیڑ بن گئے تھے۔ گرما کے موسم میں گاوں کے دھنگر اپنی اپنی بھیڑ بکریوں کو لے آتے اور اُس کے سایے میں دوپہر کا وقت کاٹتے۔ چھبو کو ساتھ لیے مجید کبھی کبھی اُن کے پاس سے گذرتا۔ اُن چرواہوں کو چھبو کی حرکتوں پر بڑی حیرت ہوتی اور وہ سوچا کرتے کہ یہ کیسا بکرا ہے جو اپنے ہم جنسوں کو چھوڑ کر ایک چھوکرے کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ چھبو کو ساتھ لے کر مجید آگے بڑھ جاتا۔ آگے جا کر وہ موہے کا ایسا درخت تلاش کرتا جس کے پھول جھڑ رہے ہوں۔ اُن پھولوں کو وہ یکجا کرتا اور اپنی ہتھیلی میں رکھ کر چھبو کو کھلاتا۔ میٹھے میٹھے مہکتے ہوے نشہ آور پھولوں کو کھا کر چھبو اُچھلنے کودنے لگ جاتا۔ اس کے بعد مجید کسی کیکر کے پیڑ کی تلاش میں آگے بڑھتا۔ وہ کیکر کی اُن ڈالیوں کو جو چھبو کی پہنچ سے دُور ہوتیں کسی لکڑی کی مدد سے کھینچ کر جھکاتا اور اُنھیں اُس وقت تک تھامے رہتا جب تک چھبو اُن کے پتے کھا نہ لیتا۔ کبھی بڑ کے درخت کے نیچے سے گذرتے ہوے اُس کے لال لال پنڈلوں کو اپنی مٹھیوں میں جمع کرتا اور چھبو کے سامنے رکھ دیتا۔ ان کے کھانے کے بعد مجید کبھی چھبو کا کان پکڑے اور کبھی اُس کے سینگ پکڑے اُس کے گلے میں ہاتھ ڈالے اُس کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگ جاتا۔ دوڑتے ہوے دونوں ندی کی طرف روانہ ہوتے۔ ندی کے ایک کونے میں جو چشمہ ہوتا مجید اُس کا پانی صاف کرتا۔ گدلے پانی کو دُور کرنے کے بعد جھرنے سے صاف پانی آنے لگتا۔ وہ پانی خود بھی پیتا اور چھبو کو بھی پلاتا۔ شام ہوتے ہوتے مجید چھبو کو لے کر اپنے چچا کے گھر پہنچ جاتا اور چھبو کو چچی کی حفاظت میں دے کر اپنے گھر لوٹ جاتا۔

چھبو جب ایک سال کا ہوا تو اُس کی عادات و اطوار سے گھر اور باہر کے سب ہی لوگ مانوس ہو گئے اور اُس سے پیار کرنے لگے۔ ہر شخص چاہتا کہ اُسے تھوڑی دیر اپنے پاس ٹھیرائے، اُس کی گردن اور اُس کے جسم پر اپنا ہاتھ پھیرے۔ یہاں تک کہ بعض لوگ اُس کے دونوں کانوں کو پکڑ کر اُس کی پیشانی

چومتے اور پھر تھپک کر اُسے وداع کرتے۔ اب مجید اسکول جاتے ہوئے چھبو کو کبھی کبھی اپنے باپ کے حوالے کر جاتا۔ وہ جہاں جہاں جاتے چھبو اُن کے ساتھ جاتا۔ گاوں کے چوپال میں وہ بیٹھے ہوتے تو چھبو چبوترے کے نیچے کھڑا ہوکر انتظار کرنے لگ جاتا اور اگر پٹیل صاحب اُسے قریب کرتے ہوئے اُس کے جسم پر سے ہاتھ پھیر کر اُس کا رُخ اپنے گھر کی طرف کرتے اور اُس سے 'جا چھبو گھر جا، جا چھبو جا' کہتے تو گھر پہنچ کر چپکے سے وہ مجید کی ماں یا دوسرے بچوں کے ساتھ کھڑا ہو جاتا۔ کبھی ماں کو کام میں لگا دیکھ کر صحن میں اپنی جگہ آ کر کھڑا ہو جاتا۔

ادھر چند دنوں سے مجید نے چھبو میں تھوڑی سی تبدیلی محسوس کی۔ چھبو بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کے پاس سے گذرتا تو وہ ایک دوسرے کو سونگھنے لگ جاتے۔ مجید کے لیے یہ بات کوی نئی نہ تھی۔ وہ جانوروں کی اس عادت سے واقف تھا۔ وہ خود بھی تھوڑی دیر وہاں ٹھہر کر تماشہ دیکھنے لگ جاتا۔ پھر چھبو کو آواز دے کر بلا لیتا اور اُسے لے کر ندی کی طرف بھاگتا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ چھبو کسی بکری کے پاس ٹھہر گیا ہو اور مجید نے اُسے آواز دے کر بلایا ہو تو اُس نے آنے میں دیر کی ہو۔ تانیال اور گھن پور دونوں گاوں کے لوگ چھبو کی اس فرماں برداری کو دیکھ کر حیرت میں پڑ جاتے۔

دن مزے میں گذر رہے تھے کہ اُسی سال بارش کی شدید کمی ہوی اور پورے ملک میں اناج اور غلے کا کال پڑ گیا۔ ریاست کا حال کچھ زیادہ ہی برا تھا۔ تانیال اور گھن پور کے کسانوں کی فصلیں تو جل گئی تھیں۔ تانیال کی سرحد میں زمینیں زیادہ تر وطن دار کی تھیں۔ وہ کسان مزدوروں سے اپنے کھیتوں پر کام کرواتا تھا۔ پھر بھی بعض کھیت پڑاوا (جس کھیت میں کاشت نہ کی گئی ہو) رہ جاتے۔ وہ اُنھیں دوسرے کسانوں کو بٹای پر نہ دیتا کہ اگر اُنھیں بٹای پر کھیت مل جایں تو پھر وہ وطن دار کی نوکری نہ کریں۔ اُس سال بارش نہ ہونے کی وجہ سے جانوروں کو تک چارہ ملنا مشکل ہو گیا تھا۔ صرف کانٹے والے درخت ہی ہرے دکھای دیتے تھے۔ تانیال کے چند بڑے کسان اور دیول کا پجاری ایک صبح وطن دار کے پاس پہنچے اور کہنے لگے :

''ڈورا گارو گاوں بہت سے جانوروں سے خالی ہو گیا ہے۔ اس سال بھی اگر بارش نہ ہوی تو لوگ بھوکوں مرجایں گے۔ ہم لوگوں نے کئی برسوں سے پوچما دیوی کی بڑی پوجا نہیں کی ہے۔ اسی لیے وہ گاوں والوں سے ناراض ہے۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ دیوی پر ایک بکرا بلی چڑھائیں۔

جب کسی نے کہا کہ گاوں میں اب کسی بھی دھنگر کے پاس کوی توانا بکرا نہیں ہے تو ایک نے شیخ

محبوب کے بکرے چھبو کی نشان دہی کی۔

''کیا شیخ محبوب اپنا بکرا دے گا'' کسی دوسرے نے کہا۔

''گاوں کے سارے بکروں اور جانوروں پر دورا کا حق ہے۔ شیخ محبوب کی کیا مجال کہ وہ دورا کو انکار کرے۔'' وہاں موجود ایک اور کسان نے سخت لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔ تم لوگ جاؤ بکرا میری طرف سے گاوں والوں کو بھینٹ ہوگا'' دورا نے کہا اور اُسی شام اپنا آدمی بھیج کر شیخ محبوب کو بلوایا۔

''ارے محبوب تو جانتا ہے کہ دو تین سال سے بارش برابر نہ ہونے سے گاوں کی کھیتی باڑی پر برا اثر پڑا ہے۔ اس سال تو بارش بالکل نہ ہوی اور اب غلہ اور چارہ تو گاوں میں ہے نہیں۔ اچھی بارش کے لیے پوجا دیوی کے مندر میں ایک بکرے کی بلی چڑھانا ضروری ہوگیا ہے۔ گاوں کے سب کسان اور پجاری بھی یہی چاہتے ہیں۔ کسی دھنگر کے پاس کوی توانا بکرا نہیں ہے۔ تم اپنے بکرے کے اگلے سال مجھ سے چار ناپ دھان لے لینا۔ میں نے گاوں والوں کو اپنی طرف سے بکرا دینے کا وعدہ کرلیا ہے۔''

دورا نے ساری باتیں اتنی تیزی سے کہی کہ بیچ میں شیخ محبوب کو کچھ بولنے کا موقع ہی نہ ملا۔ وہ بکرے کے بارے میں سوچنے لگا کہ وہ تو اُس کا اپنا نہیں ہے۔ چھبو تو مجید کا ہے۔ وہ تو اُسے دن رات ساتھ لے کر پھرتا ہے۔ لیکن شیخ محبوب اب دورا کو کیا جواب دے۔ تھوڑی دیر تک وہ چپ رہا تو دورا نے ذرا اونچی آواز میں کہا :

''کیا سوچ رہا ہے رے۔ دو تین دن میں بکرا میرے گھر چھوڑ جانا۔''

شیخ محبوب جو ابھی تک چبوترے سے ذرا دُور کھڑا ہوا تھا وہ چبوترے کے قریب آگیا اور اُس پر بیٹھ گیا۔ دورا جو آرام کرسی پر پیر پھیلائے بیٹھا تھا اپنے پیر اور بھی پھیلا لیے اور شیخ محبوب کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ شیخ محبوب پھر بھی خاموش تھا۔ اس دفعہ دورا نے گرجتے ہوئے کہا۔

''کیوں رے۔ کیا تو اپنے بکرے کے دام ابھی لینا چاہتا ہے۔ بولتا کیوں نہیں؟''

''دورا آپ اس گاوں کے راجہ ہیں۔ سارے جانور اور سارا مال آپ کا ہے۔ آپ سے کسی نے غلط کہا ہے کہ میرے پاس بکرا ہے۔ جو بکرا رات میرے گھر میں بندھا رہتا ہے وہ میرا نہیں، مجید کا بکرا ہے

''مجید کون''

''میرا بھتیجہ ،گھن پور کے پٹیل کے بیٹا۔''

''کون شیخ مولا۔ وہ میری بات کیسے ٹالے گا۔''

بات کو بگڑی ہوی محسوس کرتے ہوے شیخ محبوب نے اس دفعہ کہا :

''دورا گارو مجید اس بکرے کو بے حد چاہتا ہے۔ بکرا اُس کا لاگو ہے۔ وہ بھی ایسا پیارا بکرا ہے کہ آپ کے قریب آجاے تو آپ اُسے پیار کرنے لگ جایں۔ آپ فکر نہ کریں بلی چڑھانے کے لیے میں کہیں سے بھی دوسرے بکرے کا انتظام کر دیتا ہوں۔''

''شیخ محبوب! آج تو تر کوڑوں کی طرح بات کر رہا ہے۔'' وطن دار چیخ کر کہنے لگا۔

''بلی کے لیے تو تیرا بکرا ہی سب سے بہتر بکرا ہے۔ اب میں تجھ سے کچھ نہیں کہوں گا۔ کل صبح تک بکرا میرے گھر پر آجانا چاہیے۔ سن لیا۔''

یہ کہہ کر وطن دار اپنی کرسی سے اُٹھا اور غصے سے شیخ محبوب کی طرف دیکھتا ہوا گھر کے اندر چلا گیا۔

شیخ محبوب ڈگمگاتے قدموں سے اپنی جھونپڑی پر پہنچا۔ بکری اپنے دو نوزائدہ بچوں کو دودھ پلا رہی تھی۔ شیخ محبوب کو آتے ہوے دیکھ کر اُس نے ''میں ئیں ئیں'' کی آواز نکالی اور چپ ہوگئی۔ شیخ محبوب جھونپڑی میں داخل ہو کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ اُس وقت اُس کی بیوی چولہے کے پاس چاے بنا رہی تھی۔ وہ چاے لے کر اپنے شوہر کے پاس آی۔ اپنے شوہر کو اُداس پا کر چاے کی پیالی اُس کے ہاتھ میں تھامتے ہوے اُس کے پہلو میں پلنگ پر بیٹھ گئی۔ شیخ محبوب نے چاے پیتے ہوے اپنی بیوی کو وہ سارا واقعہ سنا دیا جو اُس کے اور وطن دار کے درمیان پیش آیا۔ بیوی نے کہا :

''اب خیر نہیں ہے۔ پچھلے سال دیور جی کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ ان وطن داروں اور دیس مکھوں کی نیت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ ابراہیم بھای کو کار کی لاٹری کا انعام ملا تو اُن کے دیس مکھ نے کار ہتیا لینا چاہی۔ اُنھیں راتوں رات سنگاپور سے بھاگ کر آنا پڑا تھا۔ اب ہماری قسمت میں بھی تانیال کا کھانا نہیں ہے۔ اس سے پہلے کہ دورا کوی نقصان پہنچاے، ہم لوگوں کو یہاں سے چلے جانا چاہیے۔''

''ارے پگلی سنگاپور تو پچیس کوس دُور ہے۔ یہ دورا تو ہمارے سر پر بیٹھا ہے۔ بھای صاحب کے کہنے پر تو اُس نے مجھے نوکری دی تھی۔ بھای صاحب دورا کی بات کو ٹال نہیں سکتے۔''

''نہیں! مندر میں بکرے کی بلی چڑھانے والا معاملہ ہے، تم جانتے ہو کہ گھر کا بچہ بچہ جھمبو کو چاہتا ہے۔ جھمبو سب کا ہے۔ جیٹھ ہرگز نہیں مانیں گے کہ اُسے بلی پر چڑھایا جاے۔''

''ان جھنجھٹوں سے بچنے کے لیے ہمیں چاہیے کہ ہم ابھی یہ جھونپڑی خالی کر دیں اور اپنے پرانے

مکان کے دالان میں جا کر رہیں۔ دورا کو جب بکرے کے معاملے میں مایوسی ہو جائے گی تو وہ کوئی دوسرا انتظام کر لے گا۔ ہم لوگ اپنے بارے میں بعد میں غور کریں گے۔''

دونوں میاں بیوی نے تانیال چھوڑنے کا طے کر لیا تو راتوں رات اپنا سامان گھن پور منتقل کر دیا۔ سامان تھا بھی کیا۔ کھانے پکانے کے چند برتن، ایک پلنگ، دو تکیے اور چار چھ چادریں۔ پہننے کے چند کپڑے۔ بکری اور اُس کے بچوں کو تو پہلی ہی ٹرپ میں منتقل کر لیا گیا تھا۔ سارا کام رات ایک بجے سے قبل تکمیل پا گیا۔ صبح صبح دورا کو علم ہوا کہ شیخ محبوب کی جھونپڑی خالی پڑی ہے تو اُس نے کہا :

''ان ترکوڑوں پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔'' پھر اُس نے شیخ مولا کے لیے آدمی دوڑایا۔ شیخ مولا جہاں دیدہ آدمی تھا۔ اُس نے دست بستہ عرض کیا۔

''دوراصاحب! محبوب بڑا بے وقوف ہے۔ اُس نے اگر آپ کو بچی بات بتائی ہوتی تو آپ غصہ نہ کرتے۔ ہم لوگوں نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ تانیال چھوڑ کر بے ہودے نے اپنی روٹی روزی گنوائی ہے۔ مہاراج آپ اپنے باپ پر گئے ہیں۔ وہ بھی بڑے رعایا پرور اور روادار آدمی تھے۔ کیا ہندو کیا مسلمان۔ آپ سارے تہوار اور ساری عیدیں مل کر مناتے ہیں۔ مسلمانوں کی ہر عید میں بھی آپ شریک رہے ہیں۔ اگلا مہینہ مسلمانوں کے لیے قربانی کا ہے۔ دوراصاحب میں نے اُس بکرے کو قربانی کے لیے رکھا ہے۔ مجید کی ماں کے نام کی قربانی ہے۔ اُس عورت کے لیے میں نے ابھی تک کچھ نہیں کیا ہے۔ ایک بار بکرا کسی کے نام پر رکھ دیا جائے تو اُسی بکرے کی قربانی دیتے ہیں۔ قربانی کا مسئلہ نہ ہوتا تو اس بکرے کو لا کر میں ابھی آپ کے قدموں میں ڈال دیتا۔''

وطن دار نے سوچا جس طرح ہندوؤں میں بلی کے نام پر رکھے ہوئے جانور کو کسی اور مقصد کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا شاید اُسی طرح مسلمانوں کے پاس بھی قربانی کی رسم ہوگی۔ اُس نے کہا :

''اچھا ایسی بات ہے تو ٹھیک ہے۔ تم نے مجھے بتا دیا ہے۔ محبوب کو شاید ڈر تھا کہ قربانی کی بات میں قبول نہیں کروں گا۔ نرا گدھا ہے تمہارا بھائی۔ اُس سے کہو کہ وہ تانیال آجائے اور پہلے کی طرح کام کرے۔''

گھن پور پہنچ کر شیخ مولا سیدھے شیخ محبوب کے پاس گیا۔ دروازے میں قدم رکھتے ہوئے وہ شیخ محبوب سے مخاطب ہوا :

''ارے نالائق تجھے کب عقل آئے گی۔ دوراصاحب نے بکرا مانگا تھا تو ہاں کر دیتا۔ بکرے کے

پیسے تو مل جاتے ۔ تیری خاطر مجھے جھوٹ بولنا پڑا۔ میں نے کہا کہ بکرا تیری بھابی کے نام پر قربانی کے لیے رکھا گیا ہے۔ اب کسی طرح بکرے کی قربانی تو دینا ہی پڑے گی ۔ مجید کو اس بات کے لیے آمادہ کرنا اب تیرا کام ہے۔ وہ بڑا ضدی بچہ ہے۔ میری نہیں مانے گا۔ وہ تجھ سے ڈرتا بھی ہے۔ تیری بات مان جائے گا۔ عید تو قریب آ گئی ہے۔ اُس دن کسی طرح بکرے کی قربانی دینا ہوگا۔ بکرا زندہ رہے گا تو میری پٹیل گری بھی جاتی رہے گی۔"

شیخ محبوب اور اُس کی بیوی ساری باتیں سنتے رہے۔ آخر میں شیخ محبوب نے کہا :

"بھائی بکرا تو آپ ہی کا ہے۔ بڑے کیا، چھوٹے کیا سب کا لاڈلا ہے۔ ایسا ہی ہے جیسے ہمارا مجید۔ فیصلہ تو آپ ہی کو کرنا ہے۔"

"تو، اب ایک کام کر۔ بکرے کے بارے میں کسی سے کچھ نہ کہہ۔ عید کے دن دوسرے بچوں کو مجید کے ساتھ لگا دینا۔ نماز کے بعد کوئی اُسے اپنے گھر لے جائے۔ اُس کے واپس ہونے تک قربانی دے دی جائے گی۔ ممکن ہے کہ وہ خوب روئے گا، چلائے گا۔ اس کے سوا تو اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔ بچہ ہے رو دھو کر چپ ہو جائے گا۔ بکرے کی قربانی تو ہو ہی چکی ہوگی۔"

عید کے دن مجید کی ماں نے صبح صبح بچوں کو نہلایا۔ اُنھیں نئے کپڑے پہننے کو دیے۔ عید گاہ کے لیے رخصت کرتے وقت اُن سے کہا :

" جانتے ہو آج کے دن جنگل میں ہرنیاں تین ٹانگوں پر کھڑی رہتی ہیں ۔ اپنے بچوں کو نماز ہونے تک دودھ نہیں پلاتیں۔ تم لوگ نماز سے جلد واپس آ جانا۔ پھر ناشتہ کرنا، سمجھے۔"

مجید نے کہا : "میں اپنے جھبو کو عید گاہ لے جاؤں گا۔ اُسے دُور کھڑا کر دوں گا۔ ہمارے آنے تک وہ وہیں ٹھہرا رہے گا۔"

ماں نے جواب دیا : "عقل گم ہوگئی ہے رے۔ آج تو قربانی کا دن ہے۔ لوگ ہنسیں گے کہ بکرے کو لے کر نماز پڑھنے آیا ہے۔"

مجید کے دونوں بھائیوں نے جو اُس سے بڑے تھے ایک ساتھ کہا :

"اے عید کے دن بھی تجھے تفریح کی سوجھی ہے۔ چلو چلو دیر ہو رہی ہے۔" یہ کہتے ہوئے اُنھوں نے مجید کا ہاتھ پکڑا اور تینوں آگے بڑھ گئے۔

نماز سے پہلے پیش امام صاحب نے قربانی کے فضائل بیان کرتے ہوئے کہا کہ جو بکرا قربانی دیا

جائے گا وہ بکرا قیامت کے دن گھر والوں کو اپنے پیٹھ پر بٹھا کر جنت میں لے جائے گا۔ بکرے کے ایک ایک بال کی ایک ایک نیکی لکھی جائے گی۔ حضرت ابراہیم نے اپنے چہیتے بیٹے کی قربانی دی تھی۔ اللہ میاں نے اُنھیں بچالیا اور بیٹے کی جگہ دُنبہ قربانی دیا گیا۔ بے شک اللہ بڑا رحیم و کریم ہے۔ اُس کے احکام ماننے والوں اور عبادت کرنے والوں کو جنت میں بڑا مقام عطا کرتا ہے۔ پھر اس کے بعد نماز ہوی، خطبہ پڑھا گیا۔ جب دُعا ہو چکی تو دین دین کی آوازوں کے ساتھ لوگ اُٹھ کھڑے ہوے اور ایک دوسرے سے بغل گیر ہونے لگے۔

اس دوران شیخ مولا نے شیخ محبوب کی طرف اشارہ کیا کہ وہ مجید اور بچوں پر نظر رکھے اور وہ چپکے سے وہاں سے نکل کر اپنے گھر پہنچ گیا۔ چھبو صحن میں کھمبے سے بندھا ہوا تھا۔ شیخ مولا نے اُس کی رسی کھولی۔ چھبو اُس کے ساتھ ہولیا۔ اُس کے کان یا سینگ پکڑ کر گھسیٹ لے جانے کی ضرورت ہی پیش نہ آی۔ چھبو "میں، میں، میں" کرتا رہا اور شیخ مولا کے ہاتھ چاٹنے لگا۔ شیخ مولا نے سوچا اسے تو کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔ اُس کے نئے کرتے کی بو چھبو کو بھا گئی تھی۔ اُس نے کرتے سے اپنی پیشانی رگڑنے کی کوشش کی۔ کرتے کو میلا ہونے سے بچانے کے لیے شیخ مولا نے چھبو کو سینگوں سے پکڑ کر اُسے دُور کیا۔ لیکن وہ پھر قریب آ گیا۔ اتنے میں قصاب بھی آ گیا۔ گھر میں ہر آنے جانے والے کو چھبو گھر کا ہی فرد سمجھتا اور اُس کے پاس بھی جاتا۔ اُسے سونگھتا اور چاٹتا۔ کوی اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتا تو وہ اپنا سر اُس کے جسم سے رگڑنے کی کوشش کرتا۔ قصاب کے ساتھ بھی چھبو نے ایسا ہی کیا۔ شیخ مولا نے چھبو کو کانوں سے پکڑ کر قصاب کے پاس سے ہٹایا۔ قصاب نے اپنی تھیلی کھولی اور اُس میں سے ایک تیز چھرا نکال کر شیخ مولا کے ہاتھ میں تھما دیا۔ چھرے کو ہاتھ میں لے کر شیخ مولا نے اپنی بیوی کو بالٹی میں پانی اور ایک لوٹا لانے کے لیے کہا۔ پانی آ گیا تو قصاب نے چھبو کو ٹانگوں سے اور سینگوں سے پکڑ کر نیچے گرا دیا۔ چھبو نے سوچا، یہ کوی نئی بات نہیں ہے۔ کبھی کبھی مجید بھی میرے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتا رہا ہے۔ لیکن چھبو کو اُس وقت بالکل مختلف لگا جب شیخ مولا نے اُس کی گردن پکڑی۔ قصاب چھبو کے سر کو زمین سے جکڑا ہے اُس کا منہ چیر کر کھولا۔ شیخ مولا نے لوٹے سے پانی کی دھار چھبو کے منہ میں ڈالی۔ یہ کیا ہے۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ چھبو کو جب بھی پیاس لگی وہ اپنی مرضی سے پانی پیتا رہا، لیکن یہاں تو زبردستی پانی اُس کے حلق میں ڈالا جا رہا ہے۔ پانی تین بار ڈالا گیا۔ شیخ مولا کی زبان سے کچھ آوازیں نکلیں اور پھر اس تیزی کے ساتھ چھبو کی گردن پر چھرا پھیرا گیا کہ وہ بڑی مشکل سے "میں......ایں......ں" کی آواز نکال سکا۔ آواز پھٹ پھٹ

کر ہوا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی ۔ خون کی چند دھاریں شیخ مولا کے کرتے کے آستین پر بھی پڑیں ۔ پھر تھوڑی دیر کے لیے شیخ مولا اور قصاب چھبو کو چھوڑ کر اُس سے پرے ہو گئے ۔ چھبو نے اپنا سر دو ایک بار زمین پر پٹکا۔ اب اُس کے گردن سے خون رس رس کر زمین میں جذب ہونے لگا۔ تھوڑی دیر تک اُس نے اپنے پاؤں ہوا میں لہرائے ۔ پھر وہ ساکت و سامت ہو گئے تو اُس کے معدے اور سینے کے پاس کی چمڑی لرزنے لگی ۔ چند لمحے لرز کر وہ بھی ساکت ہو گئی ۔ یہ ٹھیک اسی وقت ہوا جب شیخ مولا اپنے کرتے سے خون کے دھبوں کو دھو رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جب مجید گھر میں داخل ہوا تو اُس نے دیکھا دالان میں چٹائی بچھی ہوی ہے ۔ اُس پر بکرے کا گوشت ڈھیریوں کی شکل میں رکھا ہوا ہے اور پاس ہی میں چھبو کا کٹا ہوا سر کھمبے سے لٹکا ہوا ہے ۔ نیچے خون کی ایک چھوٹی سی جھیل ہے اور وہیں پر چھبو کے چاروں پائے اور کھر بھی رکھے ہیں ۔ تھوڑی دیر تک تو اُسے سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ماجرا ہے ۔ باپ کی طرف نظر پڑی تو وہ مجید کی آمد سے لاپرواہ گوشت کے حصے کرتا دکھائی دیا۔ ماں کی طرف نظر اُٹھائی تو وہ خاموش تھی اور مجید سے نظریں ملانے سے گریز کر رہی تھی ۔ اُس نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ چھبو کا یہ انجام ہو گا ۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا ۔ مجید کے بازوؤں کو مضبوطی سے پکڑ کر شیخ محبوب نے گویا اسے جکڑ لیا اور اسی طرح پکڑے پکڑے اُسے وہ گھر کے اندر لے گیا ۔ مجید تین دن تک روتا چلاتا رہا ۔ نہ اُس نے کھانا کھایا ، نہ اسے نیند آئی ۔ تیسرے دن ماں ڈرتے ڈرتے مجید کے قریب آئی اور کہنے لگی :

”تو کیسا بیٹا ہے رے میری جان کی قربانی دی گئی ہے اور تو اپنے بکرے کے لیے رو رہا ہے ۔ تجھے اپنی ماں سے ذرا بھی پیار نہیں کیا ؟ جب کوئی شخص اپنی عزیز چیز قربانی دیتا ہے تو اللہ میاں بہت خوش ہوتے ہیں ۔“

ہر شخص مجید کو اپنے طور پر سمجھاتا رہا ۔ لیکن مجید کو صبر نہ آتا تھا ۔ آخر میرا ہی بکرا کیوں قربان کیا گیا ، یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی ۔ دن گذرتے گئے اور آخرکار اس نے چھبو کے بارے میں کہنا چھوڑ دیا ۔ کہتے ہیں بچوں کا حافظہ تکلیف دہ باتیں زیادہ دنوں تک محفوظ نہیں رکھ سکتا ۔

اب مجید کی عمر پچھتر سال کی ہے ۔ وہ اپنے دادا کے گھر کے دالان میں پلنگ پر اکثر لیٹا رہتا ہے ۔ کبھی کبھی اُس کا پوتا اُس کے قریب آ کر بیٹھ جاتا ہے اور مجید اُسے جانوروں ، پرندوں ، جنات اور پریوں کی کہانیاں سناتا ہے لیکن چھبو کی کہانی وہ کبھی نہیں سناتا ۔

✠ ✠ ✠

مایا اور گاؤں

اُسے اپنے نام سے کوئی اُنسیت نہ تھی۔ کسی اور نام سے بھی رغبت نہ تھی۔ اُس نے اپنا نام رام داس سے بدل کر رامسفورڈ رکھ لیا تھا۔ اس کا سبب صرف نینسی تھی۔ نینسی امریکہ کی شہری تھی۔ اُس کا باپ جرمن تھا اور ماں ہسپانوی۔ عجیب بات تھی کہ نینسی صرف رنگ روپ سے امریکن تھی۔ عادات واطوار سے وہ ایک مشرقی عورت لگتی تھی۔

رام داس ابھی چھ سال ہی کا تھا کہ اُس کی ماں کو کالے بخار نے دبوچ لیا۔ اگلے سال کھیتی باڑی میں کام کرنے والے باپ کو کسی زہریلے سانپ نے کاٹ لیا۔ گاؤں والوں کے سامنے رام داس کے چچا اور چچی نے قسم کھائی کہ وہ اُسے اپنے بچوں کی طرح پالیں گے۔ اُنھوں نے اپنا وچن نبھایا اور رام داس کا اس قدر خیال رکھا کہ اُسے اپنے ماں باپ کو کھونے کا غم نہ ہوا۔ وہ اپنی چچی کو چھوٹی ماں اور چچا کو کاکا بابو کہہ کر بلاتا۔ ان دونوں سے اسے ماں باپ کی شفقتیں ملتی رہیں۔ اس کے باوجود اُس کے دل میں کوئی کسک رہ گئی۔ وہ عام بچوں سے مختلف ہو گیا۔ پڑھنا لکھنا اس کے دن رات کا مشغلہ بن گیا۔ اس کے علاوہ روز تھوڑی دیر کے لیے مندر جانا اور پجاری سے بھگوت گیتا کا کوئی پاٹ سننا بھی اُس کا معمول ہو گیا تھا۔

رام داس کو اکثر گم سم پا کر ایک دن پجاری نے پوچھا:

”رامو، تمہاری عمر اب بارہ سال ہو چکی ہے۔ اتنے برسوں میں تمہیں میں نے کبھی دوسرے بچوں

کی طرح ہنستے بولتے نہیں دیکھا۔ زیادہ کھیلتے بھی نہیں ہو کھیلو گے اور ہنسو گے نہیں تو تمہاری صحت بگڑ جائے گی۔ اب تو تم بڑے گیانی ہو گئے ہو' وہ کچھ رُکا، پھر مسکرا کر بولا' اور گیانی لوگ خوب ہنستے ہیں۔''

''مہاراج مجھے رونا آتا ہے نہ ہنسنا۔ پر آپ نے آج مجھ سے ایک ایسا سوال کیا ہے جو آج تک کسی نے نہیں کیا۔ میرے پاس شاید اس کا کوئی جواب بھی نہیں ہے۔''

''تمھیں کس بات کا غم ہے پتر؟''

''غم تو کسی بات کا نہیں مہاراج۔ گاؤں کے سب ہی لوگ جانتے ہیں کہ چھوٹی ماں اور کاکا باپو میرا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ ماں تو میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی گذر گئی۔ کبھی کبھی مجھے اپنے باپ کی یاد ستاتی ہے وہ بھی اب دھندلی ہوتی جارہی ہے۔''

''تمہارے ذہن سے تمہارے ماں باپ نکل نہیں پائے ہیں۔ تم اُن کی گود میں کھیل چکے ہو۔ ایسے بچے بھی جنھوں نے اپنے ماں باپ کو دیکھا تک نہیں وہ بھی اُن کی خیالی تصویر بنالیتے ہیں۔ ماں باپ مرتے نہیں ہیں پتر۔ وہ تو اپنے بچوں میں زندہ رہتے ہیں۔''

''آپ سچ کہہ رہے ہیں مہاراج۔ لیکن مہاراج مجھے ایک بات بہت ستاتی ہے، میں نے اپنے پتا کی چتا کو آگ کیوں دی تھی۔ کیا کوئی بڑا بوڑھا یہ کام نہیں کرسکتا تھا؟ میری آنکھوں میں اکثر یہ منظر گھومتا ہے۔ چتا کو آگ لگانے کی تھوڑی ہی دیر بعد اس کے شعلے لپک لپک کر چاروں طرف پھیل رہے تھے۔ میرے پتا کا جسم چڑ چڑ کرتا اکڑنے لگ گیا جیسے وہ اُٹھ کر بیٹھنا چاہتے ہوں۔ پھر آنا فانا سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا۔ یہی ہونا تھا تو مجھ سے چتا کو آگ لگانے کے لیے کیوں کہا گیا؟

''یہ کام کوئی دوسرا نہیں کرسکتا تھا پتر۔ تم چتا کو آگ نہ لگاتے تو تمہارے باپ کو مکتی نہ ملتی اور باپ کو مکتی دلانے کے لیے بیٹے ہی کو یہ کام انجام دینا پڑتا ہے۔''

''لیکن مہاراج، آپ نے ایک بار کہا تھا کہ بھیشم پتاما کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اُنھوں نے شادی بھی نہیں کی تھی پھر اُن کی چتا کو آگ کس نے دی تھی۔ انھیں مکتی ملی کہ نہیں؟''

پجاری کوئی بڑا عالم تو نہیں تھا۔ پہلے تو وہ ذرا سٹپٹایا۔ پھر سوچا بچے کو سمجھانا تو آسان بات ہے۔ اس کے بارے میں صحیفوں میں کچھ بھی لکھا نہ تھا۔ لیکن یہ بات بڑی جمتی ہے۔ اُس نے ہنس کر کہا :

''ارے بالک وہ کوئی انسان تو نہیں تھے۔ وہ ایک اوتار تھے جن کی کوئی چتا نہیں جلتی۔ اوتار آسمان سے آتے ہیں اور آسمان میں چلے جاتے ہیں...... اور دیکھو تم اس کا غم کیوں کرتے ہو۔ ہم تمام لوگ یہاں

ایک سایے کی طرح ہیں ۔ جب روشنی ختم ہو جاتی ہے تو یہ سایہ بھی باقی نہیں رہتا ۔ یہ ساری کائنات تو ایک 'مایا' ہے ۔''

رام داس نے ''مایا'' کا لفظ پہلی بار سنا تھا ۔ اُس نے پوچھا :

''مہاراج یہ 'مایا' کیا چیز ہے؟''

''اے بالک! سایے کو تم روشنی میں دیکھ سکتے ہو ۔ روشنی کے بغیر اُس کا کوی وجود نہیں ہے ۔ لیکن مایا تو گھپ اندھیرے کی طرح ہے ۔ اُسے تو من کی آنکھ ہی سے دیکھا جا سکتا ہے ۔ ذرا دھیان سے سنو ۔ یہ کہانی مجھے میرے بزرگوں نے سنای تھی ۔ ایک رُشی مہاراج سے اُن کے ششیہ نے ایک بار یہی سوال کیا تھا ۔ مہاراج نے اپنے ششیہ کے ہاتھ میں ایک کلیا پکڑا دی اور کہا کہ ''بیٹا پیاس لگی ہے، جاؤ ذرا پانی لے کر آ ۔'' یہ کہہ کر وہ ایک پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے ۔ کلیا لے کر ششیہ پانی کی تلاش میں نکلا ۔ راستے میں ایک گاؤں دکھای دیا ۔ پہلے جو مکان سامنے آیا اُس پر اُس نے دستک دی ۔ دروازہ کھلا تو کیا دیکھتا ہے ایک کومل بدن اور دمکتے چہرے کی ایک کنیا سامنے کھڑی ہے ۔ وہ دیکھتا رہ گیا ۔ کنیا کے چہرے پر پڑتی سورج کی کرنیں اُسے اور بھی منور کر رہی تھیں ۔ اُس کے چھریرے بدن کا سایہ صحن میں پڑ رہا تھا ۔ وہ کبھی سایے کو دیکھتا اور کبھی اُس کے پھول جیسے چہرے کو ۔ وہ بولنا ہی بھول گیا ۔ گویا اُس کا ذہن ماؤف اور زبان گنگ ہو گئی ہو ۔ وہ دیر تک کھڑا رہا تو کنیا کی دھیمی سی سریلی آواز نے ماحول کے سکوت کو توڑا ۔

''اتنی دیر سے کیا سوچ رہے ہیں مہاراج ؟ کیا آپ میری دہلیز کے اندر قدم نہ رکھیں گے ؟''

ششیہ کے جسم پر کپکپی سی آی ۔ اُس کا قدم بے اختیار دہلیز کو پار کر گیا ۔ کنیا پیچھے کی طرف کھسکتی گئی ۔ ششیہ آگے کی طرف بڑھتا گیا ۔ دالان میں پہنچ کر کنیا نے ایک چٹای بچھای ۔ کھانا پروسا ۔ اتنے میں کنیا کا پتا آ گیا ۔ اُس نے ترنت دونوں کی شادی رچا دی ۔ اُن کے دو خوب صورت بچے ہوے ۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی ۔ زندگی چین سکون سے بسر ہونے لگی ۔

ایک دن سورج ابھی سر پر نہیں آیا تھا کہ گاؤں کو طوفان نے آ گھیرا ۔ موسلا دھار بارش سے گاؤں کا گاؤں بہہ گیا ۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ششیہ نے اپنی بیوی کا ہاتھ تھاما، دونوں بچوں کو اپنے کاندھوں پر بٹھایا اور چنگھاڑتے ہوے پانی کو چیرتے ہوے نکلنے کی چیتنا کی ۔ اچانک زور کا ریلا آیا ۔ پہلے بیوی چھوٹی ۔ پھر ایک ایک کر کے دونوں بچے اُس کی آنکھوں کے سامنے ہی بہہ گئے ۔ جب طوفان رُکا تو ششیہ کو ہوش آیا ۔ کیا دیکھتا ہے کہ سامنے کلیا پڑی ہوی ہے جس میں پانی لانے کے لیے رُشی نے اُسے بھیجا تھا ۔ وہ کلیا میں

پانی بھر کر رشی مہاراج کی طرف بھاگا۔ مہاراج نے ششیہ کے ہاتھ سے کلیا لے لی اور پانی پی کر آشیرباد دیتے ہوئے کہا:

''تم کانپ کیوں رہے ہو بالک۔ تم تو بس یوں گئے تھے اور یوں آگئے۔''

''میرے ساتھ یہ سب کیا ہو گیا مہاراج۔ میرا پریوار، میری تمام خوشیاں، میری تمنائیں سب خاک میں مل گئیں۔ میں نے اپنے بچوں کو گود میں کھلایا پلایا تھا۔ اب تو سب کچھ اُجڑ گیا۔ میں لٹ گیا مہاراج۔''

''یہی تو مایا تھا پتر۔ یہ بات میں تمہیں کسی اور طرح سے سمجھا نہیں سکتا تھا۔''

کہانی ختم ہوی تو رام داس وہاں سے اُٹھا۔ اس نے پجاری کے پاؤں چھوے۔ اور گاؤں چھوڑ دیا۔ اُس کے پاس اب کوی اور سوال نہیں تھا۔ یہی اُس کا آخری پاٹ تھا۔ اس کے بعد سے جو بھی اُسے جاننا یا سمجھنا ہوتا وہ کتابوں میں تلاش کر لیتا۔ کتابوں کی اسی تلاش نے ایک دن اُسے شکاگو یونیورسٹی پہنچا دیا۔ اب وہ یہاں مذاہب کے تقابلی مطالعے کا پروفیسر تھا۔ نینسی اسی یونیورسٹی کی چیف لائبریرین تھی۔ دونوں سے ایک لڑکا ہوا۔ جیراللہ اُس کا نام تھا اور جس کی عمر اب بارہ سال تھی۔

رام داس کو اپنے گاؤں کی یاد بار بار ستاتی تھی۔ وہ چھوٹی ماں اور کاکا باپو کو بھولا نہیں تھا۔ وہ اُن کی خبر رکھتا تھا اور اکثر انھیں پیسے بھی بھیجا کرتا تھا۔ ایک دن جب اُسے خبر ملی کہ اُس کی چھوٹی ماں اب اس دُنیا میں نہیں رہی تو اُس نے خود کو دن بھر کمرے میں بند کر رکھا۔ جب وہ باہر نکلا تو اُس کی آنکھیں سوجی ہوی تھیں۔ نینسی نے کہا۔

''پیارے، کیوں دل ہلکا کرتے ہو۔ چلو ہم لوگ تمہارے گاؤں ہو آئیں۔ ہفتے دو ہفتے کی چھٹی لے لیں گے۔ تین دن گاؤں میں گذاریں گے۔ تمہارے کاکا باپو تو زندہ ہیں۔ اُن کا بیٹا بھی ان دنوں ساتھ ہی رہتا ہے۔ کئی برسوں سے میری آرزو ہے کہ انڈیا جاؤں۔ وہ گاؤں بھی دیکھ لوں جہاں تم پلے بڑھے ہو۔ وہ کیسی پیاری خوبصورت زمین ہوگی جہاں تم جیسے آدمی نے جنم لیا ہے۔''

''ہاں نینسی! اب تو ضرور جایں گے۔ اتنے برسوں سے میں اس لیے ٹال رہا تھا کہ ابھی تک ہمارے گاؤں میں صفای کا ٹھیک سے انتظام نہیں ہے۔ اب میں کاکا باپو کو لکھوں گا کہ وہ گھر میں ہمارے لیے ایک ٹائلٹ بنوا دیں۔ پیسے بھیج دوں گا۔ مہینے دو مہینوں کی تو بات ہے ہم ضرور جایں گے۔

کبھی کبھی انسان کے پکے ارادے بھی برسات کے موسم میں اُمڈ کر آئے بادلوں کی طرح ہوتے ہیں۔ تیز و تند ہوائیں اُنھیں کہیں سے کہیں لے جاتی ہیں۔ ٹھہرنے برسنے ہی نہیں دیتیں۔ رام داس کو اپنا

ارادہ کسی نہ کسی وجہ سے بدلنا پڑا۔ سال بھر تک وہ ہندوستان نہ جا سکا۔ اب اُسے اطلاع ملی کہ اُس کا کاکا باپو شدید علیل ہے اور یہ کہ وہ رام داس کو بار بار یاد کرتا ہے۔ رام داس کے نام خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ ''تمہاری چھوٹی ماں تو تمہیں اور تمہارے بچے کو دیکھنے کی آرزو لیے اس دُنیا سے چل بسی۔ اب میں مرنے سے قبل چاہتا ہوں کہ تم لوگوں کو ایک بار دیکھ لوں۔'' اسے پڑھ کر رام داس اور نینسی نے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ جیرالڈ اس خیال سے مچل اُٹھا کہ وہ اپنے باپ دادا کے ملک کی سیر کرے گا۔ اتنا مزہ آئے گا۔ گاؤں کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے مقامات بھی دیکھے گا۔

تین آدمیوں کا یہ چھوٹا سا قافلہ ایک شام اوہیر ایرپورٹ سے انڈیا کے جہاز سے چل پڑا۔ ممبئی میں ایک رات قیام کرنے کے بعد موٹر کار کے ذریعے تینوں رام داس کے آبائی گاؤں پہنچے۔ رام داس راستہ بھر سوچتا رہا کہ گاؤں میں کم سے کم تین دن ٹھہریں گے۔ میں بچپن کے اُن لوگوں سے ملوں گا جو اب گاؤں میں رہ گئے تھے۔ اُس کے زمانے کا پجاری تو اب نہ رہا ہوگا لیکن اُس کا کوئی وارث تو ہوگا۔ وہ گاؤں کی گلی گلی گھومے گا۔ اپنے بیٹے کو اُن کھیتوں کی سیر کرائے گا جہاں خود وہ اپنے باپ کے ساتھ کبھی جایا کرتا تھا۔ نینسی اور جیرالڈ کو انگریزی کے سوا کوئی اور زبان نہیں آتی۔ تھوڑی بہت ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنے والے شاید گاؤں میں مل جائیں۔ رام داس کو ترجمہ کا کام کرنا پڑے گا۔ مشکل تو نینسی کے ساتھ پیش آئے گی۔ وہ گاؤں کی عورتوں سے کیسے بات کرے گی۔ خود وہ عورتیں اُس کے ساتھ کیا سلوک کریں گی۔ وہ کچھ تحفے تو ضرور لے آئیں گے۔ کھانے پینے کی چیزیں تو یہ لوگ استعمال نہیں کریں گے۔ پھر عورتیں برا مان جائیں گی۔ رام داس نے سوچا مجھے یہ ساری باتیں پہلے سے دھیان میں لانا چاہیے تھیں۔ مناسب تو یہ تھا کہ وہ نینسی کو ساتھ نہ لاتا۔ لیکن نینسی ہی کا تو اصرار تھا۔ اُسی نے تو سارا پروگرام بنایا تھا۔ ماں بیٹے کو اعتماد تھا کہ وہ ہر طرح کے ماحول میں ڈھل جائیں گے۔ دو دن کی تو بات ہے۔ ایک دن تو کاکا باپو، اس کے بچے اور گھر والوں کے ساتھ گذر جائے گا۔ وہ یہ ساری باتیں سوچتا رہا اور اچانک ہی سامنے گاؤں آ گیا۔ قریب آنے پر اُسے اپنا گاؤں اجنبی سا لگا۔ گلیوں سے گذرتے ہوئے اُس نے کئی مکانوں کی دیواروں کو گرا ہوا پایا۔ گاؤں کے دوسرے کونے پر چند اونچے اونچے دو منزلہ مکان بھی نظر آئے۔ رام داس کو معلوم نہ تھا کہ یہ مکان ان لوگوں کے تھے جن کے گھر کا کوئی نہ کوئی فرد خلیجی ملک میں کام کر رہا تھا۔ گھر کے دروازے پر کاکا باپو کا بیٹا اور اُس کے بچے انتظار کر رہے تھے۔ کار کی آواز پر بچے مکان کے اندر باہر دوڑنے لگے۔ رام

داس کی کار رُکی اور جب وہ اُس سے باہر نکلا تو کا کا باپو کا بیٹا اس سے گلے مل کر رونے لگا۔ بچپن میں وہ ایک ساتھ کھیلتے تھے۔ نینسی اور جیرالڈ کو کار سے اُترتا دیکھ کر بچے کار کے قریب تو آئے لیکن اُن کی ہمت نہ ہوی کہ نینسی یا جیرالڈ کا ہاتھ تھامتے۔ یکدم گورے گورے لوگ انھیں بالکل عجیب لگے۔ کچھ دلکش اور کچھ ڈراؤنے سے۔ اندر سے زور سے کھانسنے کی آواز آئی۔ ''رامو بیٹا تم آگئے۔'' پھر اس کے ساتھ ہی سارے لوگ مکان کے اندر داخل ہو گئے۔ باپو پلنگ میں لیٹا ہوا تھا اس نے سنبھل کر بیٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اُٹھ بھی نہ سکا۔ رام داس اُس کے پلنگ کے قریب پہنچا۔ اُسے پرنام کیا۔ پھر پلنگ پر اُس کے پہلو میں بیٹھ کر اُس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ باپو دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

''کا کا باپو۔ کیوں روتے ہو۔ اب تو میں آ گیا ہوں۔''

''بیٹا میں اس لیے رو رہا ہوں کہ میں تمھیں پورے تیس سال کے بعد دیکھ رہا ہوں۔ تمہارے باپ کی قسمت میں نہ تھا کہ وہ تمھیں جوان ہوتے ہوے دیکھتا۔ بعد کی زندگی میں تمہارے ساتھ نہیں رہے اور پتہ نہیں اب کتنے دن یہاں رہو گے؟''

رام داس کے آنسو بہہ نکلے۔ شکاگو کا پروفیسر بہت پیچھے رہ گیا۔ دو ایک قطرے اُس کی کوٹ پر پڑے اور جذب ہو گئے۔ اُس نے نینسی اور جیرالڈ کو اشارے سے قریب بلایا۔ دونوں نے باپو کو پرنام کیا۔

''یہ رہا آپ کا پوترا اور یہ آپ کی بہو۔''

باپو نے ہاتھ بڑھا کر جیرالڈ کو اپنے قریب کیا اور پلنگ پر بٹھالیا۔

تھوڑی ہی دیر میں موٹر کار سے سامان نکال کر رام داس کے لیے تیار کیے ہوے کمرے میں رکھ دیا گیا۔ پھر وہ تینوں بھی وہاں آگئے۔ کمرے کو خوب صورت اور آرام دہ بنانے کی پوری کوشش کی گئی تھی۔ لیکن وہ بہ ہر حال کسانوں کا گھر تھا۔ مغربی طرز کا باتھ روم البتہ گھر کے باہر ایک کونے میں بنا ہوا تھا لیکن گرم پانی کا کوی انتظام نہ تھا۔ جو کسر رہ گئی تھی اس سے رام داس اور نینسی نے تو سمجھوتہ کر لیا۔ لیکن جیرالڈ کے پاس سوالات تھے۔ کیا یہاں سب لوگ اسی طرح رہتے ہیں۔ دیواروں پر جگہ جگہ کیلیں گڑھی تھیں۔ ایک طرف بھگوان گنیش کی تصویر کا کیلنڈر لگا تھا۔ دوسری طرف کسی فلم اسٹار کی تصویر تھی۔ دروازے کی چوکھٹ پر رنگولی بنی ہوی تھی۔

جیرالڈ کے دل میں اور بھی بہت سے سوالات تھے۔ لیکن رام داس نے اُسے ٹوکا۔ ''بیٹا ہم یہاں صرف دو دن ٹھہریں گے۔ یہی میرے باپ دادا کا گاوں ہے۔ یہیں پر میں پلا بڑھا ہوں۔ انڈیا میں گاوں

ہی گاؤں ہیں اور ان سب میں ایک طرح کی پرم پرا ہے۔

جیرالڈ نے کہا ''ڈیڈ میں جانتا ہوں دُنیا میں اور بھی کئی غریب ملک ہیں۔ آپ امریکہ نہ آتے تو شاید میں بھی یہاں پر پیدا ہوتا۔''

''تو تم شاید پیدا ہی نہ ہوتے۔'' رام داس نے ہنس کر کہا۔

دوسرے دن رام داس سویرے ہی چائے پی کر گاؤں کی سیر کو نکل گیا۔ نینسی اور جیرالڈ ابھی سو رہے تھے۔ گلیوں سے گذرتا ہوا وہ ایک ایک منظر یاد کرنے لگا۔ یہاں پاٹھ شالہ تھا۔ اب اس کی دیواریں ڈھ گئی ہیں۔ ایک بڑا اسکول گاؤں کے باہر بنا دیا گیا ہے۔ اس گلی کے نکڑ پر اُس کا ایک ہم عمر سلیم رہا کرتا تھا۔ اُس مکان کا اب صرف ایک کمرہ باقی ہے۔ اندر سے کسی کے کراہنے کی آواز آ رہی ہے۔ اور یہاں اس مندر میں اب بہت سی گھنٹیوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ پہلے تو صرف ایک گھنٹی بجتی تھی۔ مندر کی دیواروں کو پڑوس کے مکانوں تک پھیلا دیا گیا ہے۔ پہلے اس کے اندر جانے کے تین راستے تھے۔ اب صرف ایک ہی رہ گیا ہے۔ برگد کا پیڑ دور دور تک پھیل گیا ہے۔ چوپال کی اس گدی پر گاؤں کی پنچایتیں بیٹھا کرتی تھیں۔ وہ نیم کا پیڑ اب نہیں رہا...... گاؤں کی ساری گلیوں میں گھوم کر رام داس گھر واپس ہو گیا۔ واپسی میں اُس نے ہر موڑ پر دیواروں کو چھوا۔ دیواروں پر لگے ہوے پتھروں پر اپنی ہتھیلی گھسی۔ پھر جب وہ گھر میں داخل ہوا تو گھر والوں کو ناشتے پر منتظر پایا۔ نینسی اور جیرالڈ نے تو جیام اور توس ہی پر اکتفا کیا۔ رام داس نے پیٹ بھر کر سبزی اور پوری کا ناشتہ کھایا۔ ناشتے کے بعد تحفہ تحائف کا سوٹ کیس کھولا گیا۔ چند اونی کپڑے، قمیض، کچھ سفید کپڑوں کے تھان، چند رضائیاں، ہلکی رضائیاں، بیٹری سے چلنے والے اُونٹ، گھوڑے اور ڈائینوسارس، چھوٹے بچوں کے لیے کھلونے، چاکلیٹوں اور ٹافیوں کے درجنوں ڈبے، سوکھے میوؤں سے بھرے تین چار پیکٹ اور طرح طرح کے الیکٹرانک اور میک اَپ کے سامان۔ پہلے باپو کو دکھای گئیں۔ پھر سب میں تقسیم کی گئیں۔ اتنے میں گاؤں کے لوگ رام داس سے ملنے کے لیے آنے لگے۔ دوپہر تک لوگوں کا تانتا بندھا رہا۔ رام داس اُن سے باتیں کرتا رہا۔ گاؤں کے حالات پوچھتا رہا۔ کون کہاں ہے۔ کتنے لوگ خوش حال ہیں، قرضوں کا بوجھ اب کتنا ہے، بیماریاں اب تو نہیں پھیلتیں، گاؤں میں بجلی کتنے گھنٹے آتی ہے۔ نینسی اور جیرالڈ خوش ہو کر سب کو تحفے بانٹتے رہے اور لوگوں کے چہروں کے تاثرات کو دیکھتے رہے۔ دیڑھ دو بجے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد کمرے میں ٹیبل پر کھانا لگا دیا گیا۔ کھانے کے بعد تینوں نے کمرہ اندر سے بند کر لیا اور اپنے اپنے بستر پر لیٹ گئے۔ جیرالڈ نے باپ

سے پوچھا۔

''مجھے گاؤں کی سیر کب کرواؤ گے ڈیڈ۔''

''شام کی چائے کے بعد۔'' باپ نے کہا۔

وہ ستا کر اُٹھے تو تینوں کے لیے بڑی بڑی پیالیوں میں چائے پیش کی گئی۔ ساتھ ہی خشک میوہ بھی رکھا گیا۔ چائے کے بعد رام داس نے نینسی سے کہا'' آج تم یہیں باپو کے پاس بیٹھی رہو۔ میں جیر الڈ کو ذرا گھما کر لاتا ہوں۔ کل ناشتے کے بعد تم بھی میرے ساتھ چلنا۔ سارا گاؤں گھوم لیں گے۔ لوگوں سے باتیں کریں گے۔ کیا پتہ کوئی تم سے انگریزی میں بھی بات کرنے والا مل جائے۔

گھر سے نکل کر رام داس اور جیر الڈ کوئی آدھے گھنٹے بھر تک گاؤں میں گھومتے رہے۔ کہیں کہیں راستے میں ملنے والوں سے رام داس بات کرتا۔ جیر الڈ پاس میں کھڑا انھیں دیکھتا رہتا۔ اسے ہر چیز اجنبی لیکن مانوس لگتی، ذرا سی حیرت انگیز بھی لگتی خاص کر گائے، بیلوں، بکریوں کے آزاد جھنڈ جگہ جگہ پر نالیاں۔ پھر باپ بیٹا دونوں آگے بڑھ جاتے۔ تھوڑی دیر گھوم لینے کے بعد رام داس نے جیر الڈ سے کہا'' چلو، اب ہم گاؤں کے باہر کی سیر کریں گے۔ پاس میں ایک ندی بھی ہے۔''

ندی پر پہنچے تو وہ بالکل سوکھی پڑی تھی۔ شاید چند برسوں سے اس میں پانی ہی نہیں آیا۔ رام داس جس جگہ ریت کرید کر پانی کے چشمے نکالتا تھا اب وہاں ریت ہی ریت تھی۔ باپ نے بیٹے کو تفصیل بتائی۔

''جب میں چھوٹا تھا تو کبھی کبھی میرا دوست سلیم اور میں یہاں کھیلنے آیا کرتے تھے۔ بارش کے موسم میں ندی خوب بہتی تھی۔ اس کا پار کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ جب سرما کا موسم آتا تو اس کا پانی ہلکا اور صاف شفاف ہو جاتا۔ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں تیرتی دکھائی دیتیں۔ اب تو یہاں ریت ہی رہ گئی ہے اور وہ دیکھو اُس طرف پہاڑی کا سلسلہ۔ بڑا گھنا جنگل ہوا کرتا تھا۔ یہاں سے دو تین کیلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ اس جنگل میں شیر بھی تھا۔ ایک رات گاؤں سے گائے کے ایک بچھڑے کو شیر اُٹھالے گیا۔ اُن دنوں گاؤں میں ایک پادری بھی رہا کرتا تھا۔ ہر اتوار کو لوگ اُس کی باتیں سننے آجایا کرتے تھے۔ ایک چھوٹا سا گرجا گھر تھا۔ چاروں طرف درخت تھے۔ آس پاس کے گاؤں کے لوگ بھی آیا کرتے تھے۔ جس دن شیر گائے کے بچھڑے کو لے گیا وہ اتوار کی شب تھی۔ پادری کو جیسے ہی معلوم ہوا، وہ مشعلیں جلا کر اپنے چند آدمیوں کو ساتھ لے کر بے خوف اس جنگل کی طرف گیا۔ لوگوں نے ہاتھوں میں برچھے اور کلہاڑیاں اُٹھائی تھیں۔ لیکن دور دور تک شیر یا بچھڑے کا کوئی پتہ نہ لگا۔ تیسرے دن لوگوں کو کھائی کے پار چٹانوں کے پیچھے

بچھڑے کے سینگ اور کھر دکھائی پڑے۔ کئی راتوں تک گاؤں میں لوگ چین سے نہیں سوئے۔ ڈھول بجاتے اور جاگتے رہے۔

''آپ کو ڈر نہیں ہوا ڈیڈ؟''

''نہیں بیٹا۔ چھوٹے بچے شیر کے نام سے خوش ہوتے ہیں۔ اُسے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ویسے مجھے تو جانوروں کے مقابلے میں آدمیوں ہی سے ڈر لگتا ہے۔ اُسی زمانے میں ایک آدمی ڈرم بجاتا ہوا گاؤں میں گھر گھر پھرتا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک عورت ہوا کرتی تھی۔ سر پر لمبے لمبے بکھرے ہوے بال۔ ایک دم کالے۔ چہرے پر لال رنگ ملا ہوتا۔ جب وہ زبان کھولتی تو ایک لال رنگ کا چمڑہ اُس کے منہ سے لٹکتا نظر آتا۔ شاید کسی جانور کا پھیپھڑا ہوتا تھا۔ اُس سے خون کے قطرے ٹپکتے رہتے۔ مجھے اب بھی گھن آنے لگتی ہے۔ روزی کمانے کے لیے لوگ کیسے کیسے سوانگ بھرتے ہیں۔''

کچھ دیر دونوں خاموش چلتے رہے۔ پھر باپ نے کہا'' آؤ ذرا تیز چلتے ہیں۔ تمہاری ممی انتظار کر رہی ہوگی۔''

رات کے کھانے کے بعد رام داس، نینسی اور جیرالڈ تینوں کاکا باپو کے پاس دیر تک بیٹھے رہے۔ رام داس اور کاکا باپو میں باتیں ہوتی رہیں۔ جب کاکا باپو کو نیند آنے لگی تو یہ تینوں اپنے کمرے میں آکر سو رہے

صبح سویرے رام داس چاے پینے کے بعد نینسی اور جیرالڈ کو سوتا چھوڑ کر پھر سے گاؤں کی گشت کو نکلا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان دو تین دنوں میں گاؤں کی یادوں کو اپنے اندر جس قدر ہو سکے سمیٹ لے۔ گاؤں کے باہر بھی ابھی دو سمتیں دیکھنا باقی تھیں۔ مشرق اور جنوب کی سمت تو وہ گھوم آیا تھا۔ آج صبح وہ مغرب کی سمت جاے گا۔ شام کے وقت بیٹے کو لے کر شمال کی طرف نکلے گا۔ اُسی طرف تو دو ندیوں کا سنگم ہے۔ بارش کے موسم میں بہت سارے لوگ سنگم میں بہتے پانی کا نظارہ کرنے کے لیے جمع ہو جایا کرتے تھے۔ وہ اپنے بیٹے کو یہ جگہ دکھاے گا۔ ابھی تو وہ مغرب کی طرف روانہ ہوا۔ گاؤں سے ذرا فاصلے پر امرائی کے پچھلے حصے میں دو تین بڑی بڑی سیاہ فام چٹانیں تھیں۔ نشیبی علاقے کی پتھریلی زمین کا کچھ حصہ ہموار کر دیا گیا تھا اور چاروں طرف چھوٹے بڑے پتھر رکھ دیے گئے تھے۔ آس پاس کے دیہاتوں کے چند مسلمان سال میں دو بار یہاں عیدین کی نماز پڑھنے آیا کرتے تھے۔ رنگا رنگ کی شیروانیاں اور ٹوپیاں پہنے، سفید دستیاں اُچھالتے ہوے چھوٹے بچے اِدھر اُدھر بھاگتے رہتے۔ برسات کے موسم میں اس علاقہ تک پہنچنے کے لیے بہتے نالوں کو پار کرنا ہوتا۔ بڑے لوگ اپنے جوتوں کو ہاتھ میں لے لیتے اور چھوٹے بچوں کو گود میں اُٹھا کر

نالے پار کیا کرتے۔ ایسے ہی ایک موقع پر رام داس بھی ان بچوں میں شامل ہو گیا تھا۔ ایک صاحب بائیں ہاتھ میں اپنے جوتے اور دائیں ہاتھ میں اپنے بچے کو اُٹھائے ہوئے تھے۔ وہ رام داس کو بھی بہ آسانی ہاتھوں میں لٹکا کر نالا پار کر گئے۔ نماز ختم ہونے تک رام داس بھی دوسرے بچوں کے ساتھ شامل رہا۔ واپسی میں پھر اُنھیں صاحب نے اپنے بچے کے ساتھ رام داس کو بھی گود میں اُٹھالیا اور نالا پار کرآئے۔ رام داس ایک اور بار اُسی جگہ سے گذرنا چاہتا تھا۔ اُس پرانے مقام پر آکر وہ کھڑا ہو گیا۔ پھر اُس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ امرائی پہلے کی طرح گھنی نہیں تھی۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا گیا اور جب امرائی کے بیچ سے ہو کر گذرا تو سامنے چٹانیں تھیں لیکن پتھروں کا وہ حصار باقی نہیں تھا جو عیدگاہ کہلاتا تھا اور جہاں مسلمان سال میں دو بار نماز پڑھنے آیا کرتے تھا۔ رام داس حسرت سے اُن چٹانوں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ قریب پہنچ کر ایک چٹان سے ٹیک لگا کر وہ گاؤں کی طرف خالی خالی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ اُسے محسوس ہوا کہ وہ اُس کا گاؤں نہیں ہے۔ اُس کا اپنا گاؤں تو ایسا نہیں تھا۔ وہ ایک توہم تھا۔ اس نے سوچا لیکن کیا اسے اپنا گاؤں نہ سمجھنا بھی ایک توہم نہیں ہے۔ توہم اور حقیقت کے درمیان وہ کوئی لکیر کھینچ نہ پایا۔ محویت کا یہی عالم تھا کہ اُس نے چٹان کے پیچھے کچھ سرسراہٹ محسوس کی۔ اس سے پہلے کہ وہ مڑ کر دیکھتا کہ کون ہے۔ شاید کوئی اس سے ملنے آیا ہو۔ کسی نے اُس کے سر پر ایک وزنی چیز سے ایسی چوٹ ماری کہ وہ چکرا کر گر پڑا۔ وہ ہوش سنبھالنے کی کوشش میں تھا کہ اُس نے اپنے سامنے تین آدمیوں کو پایا۔ تینوں کے ہاتھوں میں کوئی نہ کوئی ہتھیار تھا۔ دو آدمیوں نے اُس کے دونوں بازوؤں پر اپنے پاؤں رکھ کر اُسے زمین سے جکڑ دیا۔ تیسرا آدمی سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک خنجر تھا۔ نیم بے ہوشی کی حالت میں رام داس نے انھیں پہچاننے کی کوشش کی۔ اس کی زبان سے رُکتے رُکتے نکلا:

''مجھے صرف اتنا بتادو کہ تم لوگ کون ہو اور مجھے کیوں مارنا چاہتے ہو؟''

''ٹھیک ہے تمہاری یہ خواہش پوری کردی جائے گی۔ تم اپنے گاؤں آئے ہو، ہم تمہیں بتادیں کہ کوئی اور نہیں ہم ہی تمہارا گاؤں ہیں اس لیے کہ تمہارا گاؤں ہمارے احکام بجالاتا ہے۔'' دائیں جانب کھڑے شخص نے رام داس کے مونڈھوں کو اپنے پاؤں کی بھرپور طاقت سے کچلتے ہوئے کہا۔ اور بائیں جانب کھڑے ہوئے شخص نے رام داس کے منہ پر ایک لات ماری اور کہا:

''نام بدلنے کا اتنا ہی شوق تھا تو فورڈ کے ساتھ کوئی اور نام جوڑ لیتا، اپنے نام کے ساتھ رام کو جوڑا ہے تو اسی گاؤں کی راکھ بن کر رہ۔''

رام داس کے سینے پر جم کر بیٹھے ہوئے آدمی کا خنجر ہوا میں لہرایا۔اس کے ساتھ ہی رام داس کے دونوں ہاتھ بھی اُوپر کو اٹھنے لگے جیسے وہ اپنے قاتلوں کو پرنام کرنا چاہتا ہو لیکن وہ اُس تیزی سے اُوپر اُٹھ نہ سکے جس تیزی سے چمکتا ہوا خنجر اُس کے سینے میں اُتر گیا۔

✠ ✠ ✠

کھلونے والا

کاؤس کو اپنے بیٹے کے قاتل ہرمُز کی تلاش تھی۔ اس تلاش میں اُس نے اپنی دولت پانی کی طرح بہادی۔ اس نے شہر شہر اور گاؤں گاؤں اپنے خانگی جاسوس بھیجے۔ اور جب اُس کے تمام جاسوس ہر طرف سے ناکام لوٹ آئے تو اُسے ایک ترکیب سوجھی۔ کاؤس نے علم نجوم سیکھنا شروع کردیا اور جب وہ اس میں ماہر ہوگیا تو اُسے خیال ہوا کہ صرف علم نجوم کی بدولت وہ ہرمُز تک رسائی حاصل نہ کرسکے گا۔ پھر اُس نے پامسٹری بھی سیکھی۔ اپنے ایک ایک رشتہ دار اور ایک ایک دوست کے ہاتھوں کی لکیروں کے نشان اُس نے حاصل کیے۔ اُن کا بھرپور جائزہ لیا۔ ایک ایک کی نفسیات کو، اور اُن کے کارناموں کو پرکھا۔ جب اُسے ان دونوں علوم پر مہارت حاصل ہوگئی تو اُس نے بازار سے ایک طوطا خریدا۔ ایسا طوطا جس کی ناک اور جس کے چشم کو دیکھ کر اُسے بھروسہ ہوگیا کہ یہ طوطا اُس کے کام کا ہے۔ پھر اُس نے طوطے کی تربیت شروع کردی۔ پہلے تو اُسے ذائقہ دار اور اچھی اچھی غذائیں کھلائیں اور جب وہ اُن کا عادی ہوگیا تو اُس کے پاؤں میں ریشم کی ایک ڈوری باندھ دی۔ طوطے کو اُس وقت تک اُس کی پسند کی غذا نہیں ملتی جب تک کہ وہ کاؤس کے کہے ہوئے جملوں کو دہرانہ دیتا۔ آہستہ آہستہ طوطا تربیت پاگیا۔ کاؤس جب بھی طوطے کے پاؤں میں بندھی ڈوری کو ایک جھٹکا دیتا تو وہ اُونچی آواز میں پکار اُٹھتا: ''تیری قسمت کا حال!'' اور جب کبھی کاؤس اُس ڈوری کو دوبارہ کھینچتا تو طوطا چیخ اُٹھتا: ''تیری قسمت کا حال میرے پنجے میں!۔''

جب کاؤس کو اطمینان ہو گیا کہ طوطا مکمل طور پر تربیت پا چکا ہے تو تب اُس نے ایک توانا بندر خریدا۔ اُسے بھی اسی طرح سُدھایا۔ پہلے اُسے عُمدہ غذائیں کھلائیں۔ پھر بھوکا رکھا۔ پھر غذائیں دیں۔ اچھی اور عمدہ غذائیں دے کر اُسے پہلے سے زیادہ توانا بنا دیا۔ پھر اُسے چند اشارے سمجھائے۔ جب بندر انھیں اچھی طرح سمجھنے لگ گیا تو اُس کے ہاتھ میں ایک کھلونے والا پستول دیا۔ اور جب وہ پستول اچھی طرح پکڑنا سیکھ گیا تو کاؤس نے اُس میں ایک پلاسٹک کی گولی بھری۔ پھر پستول کو بندر کے ہاتھ میں دے کر کاؤس نے پستول داغ دیا۔ پستول کی نال سے شعلہ نکلتا دیکھ کر بندر اِدھر اُدھر ناچنے کودنے لگا۔ جب بار بار پستول سے شعلہ نکلنے لگا تو بندر اس کا عادی ہو گیا۔ اگلا کام بڑی نزاکت اور محنت کا تھا۔ کاؤس نے پلاسٹر آف پیرس کے چند مجسمے بنائے۔ اب نئے سرے سے بندر کو سدھایا۔ کاؤس جب بھی کسی مجسمے کے سر پر ہاتھ رکھتا تو بندر کا کام تھا کہ وہ جھٹ اُس مجسمے پر پستول داغ دے۔ چار، چھ، آٹھ دس کتنے ہی مجسمے ہوتے۔ اُن میں سے جس مجسمے پر بھی کاؤس ہاتھ رکھتا، بندر بے کھٹکے اسے اپنے پستول کا نشانہ بناتا۔

اس کام کی بھی اچھی طرح مشق ہو گئی تو ایک اور کٹھن مرحلہ طے ہونا شروع ہوا۔ اس دفعہ کاؤس نے سچ مچ کا پستول استعمال کیا۔ پہلے تو ایک ہی گولی چلائی گئی۔ آواز زیادہ زوردار تھی اور شعلہ بھی زیادہ گرم اور روشن تھا۔ بندر اور زیادہ بھڑکا، اس نے اور بھی اُچھل کود کی۔ لیکن آہستہ آہستہ کاؤس کی تربیت، چمکار اور غذاؤں کے لالچ نے اُسے رام کر ہی لیا۔ پہلے ایک گولی چلانے کی عادت ڈالی گئی۔ پھر گولیوں کی تعداد بڑھتی گئی اور بالآخر تو یہ ہوا کہ جتنی دیر تک مجسمے کے سر پر کاؤس کا ہاتھ رکھا ہوتا بندر کا پستول گولیاں اُگلتا رہتا۔ یہاں تک کہ پستول خالی ہو جاتا۔ بار بار کی مشق کے بعد کاؤس کو پورا اطمینان ہو گیا کہ جب وہ ہرمُز کا پتا لگا لے گا تو بندر کا پستول اسے ڈھیر کرنے میں دیر نہ لگائے گا۔

طوطے اور بندر کی تربیت سے فراغت پا کر کاؤس نے اپنے دوستوں سے مشورہ کیا کہ ہرمُز کو کہاں اور کس طرح پایا جا سکتا ہے؟ دوستوں نے کہا ہرمُز کا پتہ لگانا آسان کام نہیں ہے، اُس نے اپنا نام ور حلیہ بدل لیا ہوگا۔ یا پھر بھیس بدل کر کہیں ٹھیلے خوانچے والوں میں شریک ہو گیا ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جلد جلد جگہ بدلتے ہوئے شہر شہر گھومتا پھر رہا ہوگا۔ ''لاکھوں کی آبادی والے اس ملک میں اُسے بھلا کہاں تلاش کرو گے؟ اور کر بھی لو تو اُسے سزا کیسے دلواؤ گے؟ تمہارے پاس تو کوئی ثبوت بھی نہیں ہے۔'' کاؤس کے دوستوں کو اس کی خفیہ اسکیم سے واقفیت نہ تھی۔ وہ تو صرف اتنا جانتے تھے کہ کاؤس نے اپنا دل بہلانے کے لیے ایک طوطے اور بندر کو پال لیا ہے۔

آخر وہ دن آ ہی گیا جب کاؤس نے اپنی اسکیم کے مطابق اپنا کاروبار اپنے سکریٹری کے سپرد کیا۔ اُس نے کہا کہ وہ ایک طویل عرصے کے لیے شہر سے باہر جا رہا ہے اور یہ کہ اُس کی تلاش نہ کی جائے۔ ضرورت پر وہ خود ہی سکریٹری سے ربط پیدا کر لے گا۔ سکریٹری کو بھی کاؤس نے کئی طرح کے لالچ دے کر اپنی ہدایتوں سے اُسی طرح جکڑ دیا جیسے اُس نے طوطے اور بندر کو جکڑ دیا تھا۔ پوری طرح سے مطمئن ہو کر کاؤس چند ضروری اشیا کے ساتھ طوطے اور بندر کو لیے ایک دن سویرے ہی شہر سے نکل پڑا۔ پہلے اُس نے ایک جنگل میں پڑاؤ ڈالا۔ تین دن بعد بھیس بدل کر اُس نے اپنے اصلی لباس کو ایک بیاگ میں رکھ دیا۔ پستول اور کارتوس تو پہلے ہی سے اس نے اپنے کپڑوں میں چھپا لیے تھے، بندر کے ہاتھ میں اُس نے کھلونے والا پستول دے دیا تاکہ جب بندر اصلی پستول ہاتھ میں لے تو لوگوں کو شبہ نہ ہو۔ اب وہ شہر کو جانے والی شاہراہ کی تلاش میں نکل پڑا۔ ایک چوڑی سڑک پر پہنچ کر اُس نے دیکھا، بسوں، کاروں اور ٹرکوں کی بڑی آمد و رفت ہے۔ اُس نے ایک ٹرک پکڑی اور قریب کے شہر میں پہنچ گیا۔ رات ایک سرائے میں سو رہا۔ صبح ضروری کاموں سے فارغ ہو کر دوپہر تک وہ ایک مناسب چوراہے پر پہنچ گیا اور ایک بہت مصروف نکڑ پر اپنے طوطے اور بندر کو لے کر بیٹھ گیا۔ شہر کے لوگوں نے پہلی بار کسی نجومی کو طوطے کے علاوہ بندر کے ساتھ دیکھا تھا۔ شاہراہ پر سے گذرنے والوں میں حسبِ معمول چند ایسے بھی تھے جو اپنی قسمت کا حال جاننا چاہتے تھے۔ ایسے لوگ بے اختیار ہو کر کاؤس کی طرف لپکتے تھے اور جب بھی کوئی شخص کاؤس کے قریب آتا تو کاؤس طوطے کے پاؤں کی ڈوری کو پکڑ کر ایک جھٹکا دیتا۔ طوطا فوراً پکار اُٹھتا۔ ''تیری قسمت کا حال!۔'' آدمی کاؤس کے سامنے بیٹھ جاتا۔ تب کاؤس طوطے کی ڈوری کو دوبارہ کھینچتا۔ طوطا پھر سے چیخ اُٹھتا۔ ''تیری قسمت کا حال میرے پنجے میں!۔'' اس کے فوراً بعد وہ اپنی چونچ سے اُن کارڈس میں سے ایک کارڈ اُٹھا لیتا جس پر کچھ اعداد چھپے ہوتے اور لوگوں کی قسمتوں کا حال بھی لکھا ہوتا۔ کاؤس اُس کارڈ کو طوطے کی چونچ سے لے لیتا اور اپنے گاہک کے ہاتھ کی لکیریں پڑھنے لگ جاتا۔ لوگ حیرت میں پڑ جاتے جب کاؤس اُن کی پچھلی زندگی کے حادثات اور واقعات بے تکان دھراتا چلا جاتا۔ گاہک کا نام اور اُس کی تاریخ پیدائش پوچھ کر کاؤس اُن کے مستقبل کی پیشن گوئی کرتا۔ یہ دھندا اتنا کامیاب ہوا کہ دوسرے دن اُس کے گاہکوں کی تعداد دوگنی ہو گئی۔ لیکن وہ کسی جگہ دو تین دن سے زاید نہیں ٹھہرتا۔ لوگوں کو اپنا مشتاق بنا کر وہ راتوں رات چمپت ہو جاتا، اسی طرح وہ شہر شہر اور قریہ قریہ گھومنے لگا۔ وہ کہیں بسوں اور ریلوے اسٹیشنوں کے پاس کھڑے ہو کر آنے جانے والوں کے چہرے دیکھتا رہتا۔ کبھی پارکوں اور تفریحی

گاہوں کے چکر لگاتا۔ اس طرح آوارہ گردی میں ایک عرصہ گذر گیا۔ ہرمُز کا کہیں پتہ نہ لگا۔ کاؤس ذرا بھی مایوس نہ ہوا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ جلد یا بہ دیر اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوگا۔ وہ کسی طرح خالی ہاتھ اپنے شہر کو لوٹنے والا نہیں۔

ایک دن اپنے کاندھے پر بندر کو بٹھائے اور ہاتھ میں طوطے کا پنجرہ اور بیاگ لیے کاؤس سمندر کے کنارے پہنچ گیا۔ شام کا وقت تھا۔ دور دور تک ساحل پر ریت ہی ریت تھی۔ لوگوں کی بھیڑ تھی۔ کاؤس نے سوچا وہ کسی ایک جگہ بیٹھے رہنے کے بجائے ساحل پر گھومے گا۔ دیکھیں پردۂ قدرت سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ ایک جگہ اُسے چند بچے کھلونے خریدتے ہوئے دکھائی پڑے۔ وہ اُن کی طرف بڑھا۔ کھلونے والے کے ساتھ ایک عورت بھی تھی جو کھلونے بیچنے والے کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ اُس کی بغل میں بھی ایک صندوقچہ لٹک رہا تھا۔ اس میں طرح طرح کے کھلونے تھے۔ ان دونوں کے قریب سے گذرتے ہوئے کاؤس نے چپکے سے ڈوری کو جھٹکا دیا۔ طوطا پکار اُٹھا : ''تیری قسمت کا حال!۔'' عورت نے پلٹ کر طوطے والے کی طرف دیکھا۔ کاؤس نے چند لمحوں کے بعد دوبارہ ڈوری کا جھٹکا دیا۔ طوطے نے پھر وہی آواز نکالی۔ ''تیری قسمت کا حال!۔'' اس دفعہ عورت نے کھلونے والے کے کان میں کچھ کہا۔ اُس نے جواب دیا'' ہاں میں سن چکا ہوں۔ یہ طوطا تمہاری قسمت کا حال کیا بتائے گا لیکن اگر تم چاہتی ہو کہ تھوڑی دیر کے لیے اپنا دل بہلا لو تو تم جا سکتی ہو۔'' یہ سن کر عورت تیزی سے کاؤس کے پاس پہنچ گئی۔ کاؤس جہاں تھا وہیں بیٹھ گیا اور طوطے کو پنجرے سے نکال کر اُس کے پاؤں کی ڈوری کو دوبار جھٹکا دیا۔ طوطے نے اس دفعہ آواز دی'' تیری قسمت کا حال میرے پنجے میں!۔'' یہ کہتے ہوئے طوطے نے سامنے رکھے ہوئے کارڈوں میں سے ایک کارڈ اپنی چونچ میں پکڑ لیا۔ کاؤس نے کارڈ طوطے کی چونچ سے لے کر عورت کی طرف دیکھا۔ پھر ایک ہاتھ میں کارڈ اور دوسرے ہاتھ میں عورت کا ہاتھ لے کر اس کی ہتھیلی تھامے تھامے کاؤس نے اُس کے ماضی کے بارے میں کہنا شروع کر دیا۔ عورت بڑی حیرت سے اُس کی باتیں سنتی رہی۔ وہ بھول گئی کہ اسے جلد ہی کھلونے والے کے پاس لوٹنا ہے۔ اس عرصے میں بندر ہاتھ میں پستول لیے اور ٹکٹکی باندھے کبھی ان دونوں کو اور کبھی سامنے سے گذرنے والوں کو دیکھتا رہا۔ جب عورت کو کاؤس کے پاس خاصی دیر ہوگئی تو کھلونے والے نے ان لوگوں کی طرف دیکھا۔ سب بچے کھلونے خرید کر جا چکے تھے اور کوئی نیا گاہک نظر نہ آتا تھا۔ وہ کاؤس کی طرف بڑھا۔ اور ابھی قریب بھی نہ پہنچنے پایا تھا کہ عورت نے نجومی کی تعریف شروع کر دی۔ ''اس آدمی نے تو میرا سارا ماضی کھول کر رکھ دیا ہے۔ چند باتیں تو مجھے

بھی یاد نہیں تھیں۔اب یہ میری اگلی زندگی کے بارے میں بھی کہنے والا ہے۔ایک بار تم بھی اپنا ہاتھ دکھا دو تو مان جاؤ گے۔''

کھلونے والے نے عورت کی بات سنی اَن سنی کر دی تو کاؤس نے پہل کی۔''میرا طوطا کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔یہ خاتون تو آپ کے ساتھ ہیں نا!ان سے پوچھ لیجیے۔ابھی تک تو میں نے ان کے ماضی کی ساری باتیں بتا دی ہیں۔مستقبل بھی آزما لیں۔'' یہ کہہ کر کاؤس نے اپنے طوطے کے پاؤں کی ڈوری کو ایک جھٹکا دیا۔طوطا پکار اُٹھا۔''تیری قسمت کا حال!۔''

''دیکھا آپ نے میرا طوطا آپ کی قسمت کا سب حال بتا دے گا۔آپ کے چہرے سے لگتا ہے کہ آپ بڑے ہی اہم اور نیک آدمی ہیں۔بیچ میں کچھ دراڑ آ گئی ہے۔ویسے ان کھلونوں کے کاروبار نے آپ کو خوش حال کر دیا ہے۔آپ اور بہت ترقی کریں گے۔یہ آپ کا مستقل پیشہ نہیں ہے۔آپ کی پیشانی بتاتی ہے کہ آپ کی ساری دُنیا میں قدر ہو گی۔آپ کے پاس دولت بھی ہو گی۔کوٹھی بنگلے ہوں گے۔کاریں ہوں گی۔لیکن آپ تو ان سب چیزوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔قسمت میں جو ہو گا اُس سے آدمی بچ نہیں سکتا۔''

اتنا سب کچھ سن کر عورت نے کہا''کیا ہرج ہے اپنا ہاتھ انھیں بتا دینے میں۔بھلے سے آپ اس پر یقین نہ رکھتے ہوں۔مجھے تو یقین ہے کہ اس کا علم پکا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اُس نے کھلونے والے کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور کاؤس کے ہاتھ میں دے دیا۔

کھلونے والے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کاؤس دیر تک اُس کی ہتھیلی کا جائزہ لیتا رہا۔اتنی ہی دیر تک وہ اُس کے چہرے کو بھی پڑھتا رہا۔کبھی وہ ہتھیلی کو دیکھتا اور کبھی چہرے کو۔پھر اُس نے کہا۔

''آپ اتنے بڑے آدمی ہو کر کھلونے کیوں بیچ رہے ہیں؟''

کھلونے والے کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آ ئی۔اُس نے سوچا سارے نجومی ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔کبھی کبھی اُن کا تیر نشانے پر لگ جاتا ہے۔اُس نے کاؤس کو جواب دیا۔''ہاں میں نے ورثے میں بڑی دولت پائی تھی۔لیکن اب تو میں کھلونے بیچ رہا ہوں۔یہ خاتون میرا ہاتھ بٹاتی ہے۔ہم لوگ خوب کما لیتے ہیں۔لیکن اگر تم اپنے علم کے پکے ہو تو یہ بتاؤ کہ یہ عورت میری بیوی ہے یا میری بہن۔'' کھلونے والے نے کاؤس کو مات دینے کے خیال سے پوچھا۔

کاؤس ایک لمحے کے لیے سٹ پٹا گیا۔پھر اُس نے قیافہ شناسی سے کام لیا۔عورت اس شخص سے

عمر میں بڑی ہے۔ اگر یہ اس کی بیوی ہوتی تو کھلونے والا یہ سوال ہی نہ کرتا۔ یہ اس کی بہن ضرور ہوگی۔ صورت شکل بھی ملتی جلتی ہے۔ اُس نے کہا۔ ''یہ آپ کی بیوی نہیں۔ بڑی بہن ہیں۔''

''دھوکہ کھا گئے نا! تم نے شاید ہماری عمروں کے لحاظ سے یہ اندازہ لگایا ہوگا۔ یہ خاتون میری نکاح میں ہے۔ یہ میری بیوی ہے۔ ایک شہر میں اس سے ملاقات ہوگئی۔ اس نے میرے ساتھ رہنا پسند کیا۔ مجھے بھی ضرورت تھی۔ میں نے ساتھ کرلیا۔''

کھلونے والے کی بات میں تمسخر کی جھلک تھی۔ کاؤس نے خفت محسوس کی۔

''شاید مجھ سے غلطی ہوگئی۔ آپ اپنا دوسرا ہاتھ تو بتائیں۔''

''اب دوسرا ہاتھ دیکھ کر کیا کرو گے۔ یہ بتاؤ تم کہاں کے رہنے والے ہو۔ میں دو مہینہ سے اس شہر میں ہوں۔ تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔'' کھلونے والے نے پوچھا۔

''میں یہاں اجنبی ہوں۔ ابھی ابھی آیا ہوں۔ کسی شہر میں دو تین دن سے زیادہ نہیں ٹھہرتا۔ لیکن شاید اس شہر میں مجھے زیادہ ٹھہرنا پڑے۔ آپ لوگوں سے باتیں کر کے مجھے اچھا لگا۔''

''مجھے بھی اچھا ہی لگا۔ تمہارے نجوم اور تمہاری پامسٹری میں تو میرا کوئی یقین نہیں ہے۔ تمہارے ساتھ طوطا ہے۔ لیکن یہ بندر اور بندر کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر اچھنبا ہوتا ہے۔ اور یہ بندر کتنا خاموش ہے۔ بڑا گھونا لگتا ہے۔ سنو۔ میں بھی کسی شہر میں زیادہ نہیں ٹھہرتا۔ زیادہ سے زیادہ چار چھ مہینے۔ ایک مکان کرایے پر لے رکھا ہے۔ تم بھی ہمارے ساتھ آجاؤ تو کیسی رہے؟ ایک دو کمرے خالی پڑے ہیں۔ تمہیں کرایہ دینے کی بھی ضرورت نہیں۔''

''زندگی بھی کس قدر انوکھی ہے۔ اس طرح کے نیک لوگوں کا ساتھ ہو جائے گا میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔'' کاؤس نے کہا۔

رات بھیگنے لگی تھی۔ تفریح کو آئے ہوئے لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس ہونے لگے۔ کھلونے والے نے اپنا سامان سمیٹا۔ کاؤس نے بندر کو اپنے کاندھے پر بٹھالیا اور پھر یہ تینوں کھلونے والے کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں کسی نے کسی سے بات نہیں کی۔ جب گھر آگیا تو کھلونے والے نے کاؤس کو خالی کمرہ بتا دیا کہ لو یہ تمہارا مستقر ہے۔

ہر صبح وہ تینوں ناشتے کے بعد ایک ساتھ گھر سے نکلتے۔ نہ کاؤس ہی نے کھلونے والے کا نام پوچھا نہ کھلونے والے ہی نے کاؤس کا۔ ایک دوسرے کو وہ تم اور آپ سے مخاطب کرتے۔ کھلونے والا اور اُس

کی بیوی دونوں کھلونے بیچنے میں لگ جاتے ۔ بندر والا ساتھ میں ہوتا ۔ یہ ملاپ لوگوں کو عجیب سا لگتا ۔ لوگ کثیر تعداد میں ان کی طرف متوجہ ہوتے رہے ۔ بندر کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر اکثر بچے اپنے لیے بھی پستول خریدتے ۔ اس طرح کھلونے والے کا مال خوب بکنے لگا ۔ کاؤس کو اپنا ہاتھ بتانے والے بہت کم ملتے ۔ ان کی اُسے ضرورت بھی نہ تھی ۔ کھلونے والے کا معاملہ جب تک واضح نہیں ہو جاتا وہ دوسرے کا ہاتھ دیکھ کر کیا کرے گا ۔ پھر کھلونے والا ہر شام یہ کہہ کر کاؤس کے ہاتھ میں تھوڑے سے پیسے رکھ دیتا کہ یہ اُس کا حصہ ہے ۔

کاؤس کو اُلجھن سی ہونے لگی ، یہ کیسا آدمی ہے؟ ایک اجنبی کو مہمان بنالیا ۔ ساتھ میں اُس کی بیوی بھی ہے ۔ بِکری کے پیسوں میں میرا حصہ نکالتا ہے صرف اس بات پر کہ میرے بندر کی وجہ اس کا مال خوب بک رہا ہے ۔ گاہکوں سے زیادہ منافع بھی نہیں لیتا ۔ ناقص کھلونوں کو بیچنے کی کوشش نہیں کرتا ۔ اُنھیں ضائع کر دیتا ہے ۔ میرے قیام وطعام کے پیسے بھی نہیں مانگتا ۔ نہ مجھے جانے کے لیے ہی کہتا ہے ۔ لیکن یہی آدمی میرے بیٹے کا قاتل بھی ہو سکتا ہے ۔ آدمی کے کتنے روپ ہوتے ہیں ۔ میرے لڑکے کو قتل کر کے شاید یہ پچھتا رہا ہوگا ۔ لیکن اگر یہی قاتل ہے تو میں اسے ہرگز نہیں چھوڑوں گا ۔ دُنیا دیکھے گی ، ایک دن اس کی عورت کے سامنے ہی میرا بندر اس کا کام تمام کر دے گا ۔ یہی تو میرے جوان بیٹے ارابل کا قاتل ہے ۔

ارابل کوئی نیک آدمی نہیں تھا ۔ شروع ہی سے بگڑا ہوا ۔ جن لوگوں کے ساتھ رہا وہ سب کے سب دولت منداور عیش وعشرت کے عادی تھے ۔ کالج میں داخل ہوا تو بڑی بڑی کاروں میں گھومنا پھرنا ، شہر شہر تفریح گاہوں کی سیر ، اپنے پرایوں سے آئے دن جھگڑے کرنا ۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں حاصل کرنے کے لیے قاعدے قوانین توڑنا ۔ غرض ہر بری عادت کی لت پڑ گئی تھی اور ارابل اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے کچھ بھی کر بیٹھتا تھا ۔ اکلوتے بیٹے کے پیار نے باپ کو اندھا کر دیا تھا ۔ وہ کسی بھی وقت اپنے بیٹے کو ناخوش دیکھنا نہیں چاہتا تھا ۔ بیٹے کے مستقبل کے لیے باپ نے اپنی دولت کا بڑا حصہ خرچ کر کے شہر میں سب سے قیمتی زمین خریدی ۔ اُس میں باغات اور چمن لگوائے ۔ نہریں کھدوائیں ۔ ایک خوب صورت محل کھڑا کر دیا ۔ ارابل اُس میں منتقل ہو کر باپ کی تھوڑی بہت نگرانی سے بھی آزاد ہو گیا ۔ اُسے اپنے محل میں ایک بات کھٹکتی تھی ۔ باغ کی چار دیواری سے متصل ایک قبرستان تھا ۔ پہلی ہی بار نظر پڑتے ہی اُس نے طے کر لیا کہ کسی طرح وہ اس قبرستان کا صفایا کر دے گا ۔ اُس زمین کو اپنے احاطے میں شامل کر لے گا اور وہاں نئے

نئے درخت لگوائے گا۔ اسے اپنے باپ کی طاقت کا اندازہ تھا۔ اُس کا شمار شہر کے با اثر لوگوں میں ہوتا تھا۔ ان سب کی ایک برادری تھی۔ وہ ایک دوسرے کی حمایت میں مُردوں کے مزار تو کیا کئی زندوں کے مسکن ملیامیٹ کر سکتے تھے۔

محل میں منتقل ہونے کے تھوڑے ہی دنوں میں ارابل نے قبروں کو ڈھانے کا کام شروع کر دیا۔ ہر رات وہ اپنے آدمیوں کی مدد سے ایک دو قبریں ڈھا دیتا۔ جن لوگوں کے عزیز ان قبروں میں دفن تھے اُنھیں جب اطلاع ملی تو وہ بے چین ہو گئے۔ قبروں کو واپس حاصل کرنے کی ساری کوششیں ناکام ہو گئیں تو وہ ٹولیاں بنا کر رات رات بھر قبرستان کی نگرانی کرنے لگ گئے۔ اس کے باوجود قبروں کو ڈھانے کا سلسلہ جاری رہا۔ ارابل کے غنڈوں کو روکنے کی ہمت لوگوں میں نہ تھی۔ ان کی بے چینی بڑھتی گئی۔ لیکن جب اُنھوں نے اجتماعی احتجاج کا سہارا لیا تو راتوں رات اُن کے رہنماؤں کو غائب کر دیا گیا۔ کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ وہ زندہ ہیں یا مار ڈالے گئے۔ جن قبروں کو ڈھا دیا گیا تھا اُن میں ہرمُز کی ماں کی قبر بھی تھی۔ قبر کو ڈھانے میں مدفون کی ہڈیاں باہر زمین پر نکل آئیں۔ اس قبر سے لگی ہوی ہرمُز کے باپ کی قبر تھی۔ اب اُس قبر کی باری تھی۔ ہرمُز کے قبیلے کے لوگ زیادہ ہی بے جگر تھے۔ اُنھوں نے ہرمُز کی ماں کی قبر کو پاٹ دیا۔ باہر بکھری ہوی ہڈیوں کو دوبارہ دفن کر دیا۔ اور عہد کیا کہ اب کسی قیمت پر ہرمُز کے باپ کی قبر کو بے حرمت ہونے نہ دیا جائے گا۔ دوسرے ہی دن ارابل کے کارندوں نے اس کے نیم جاں جسم کو پائیں باغ میں تڑپتا ہوا پایا۔ جسم پر جگہ جگہ خنجر کے نشان تھے۔ کاؤس کی موجودگی میں آخری سانس لیتے ہوے ارابل نے ہرمُز کا نام لیا تھا۔ اُسی لمحہ کاؤس نے قسم کھالی کہ وہ کسی طرح ہرمُز کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ ہرمُز ہی نہیں، اُس کے خاندان کے ایک ایک فرد کو چن چن کر مار ڈالے گا۔ چناں چہ اُس نے پہلے ہرمُز کے بھای اور ہرمُز کی بیوی کا قتل کروا دیا۔ وقفے وقفے سے ہرمُز کے خاندان کے آٹھ دس آدمی مروا ڈالے گئے۔ اتنی ساری تباہی کے باوجود ہرمُز مشتعل ہو کر کوی کام کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کاؤس کے کارندے مزید شدت پر اُتر آئے تو ہرمُز نے ایک دوسرا فیصلہ کیا۔ اُس نے طے کر لیا کہ وہ امن و امان کے راستہ کو نہیں چھوڑے گا۔ اس مقصود پر قائم رہنے کے لیے اُسے اپنے اندر پیغمبرانہ صلاحیتیں پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔ وہ اپنے آپ کو تیار کرے گا۔ لوگوں کو بدلنے کے لیے صدیاں درکار ہوں گی تو سہی۔ میں اپنی ساری زندگی اس کام میں لگا دوں گا اور دوسروں کو بھی تیار کروں گا۔ یہ سوچ کر وہ راتوں رات بھیس بدل کر شہر سے نکل گیا۔ وہ جہاں بھی رہتا اُس کے پیروؤں کو اس کی اطلاع ہو جاتی۔ وہ ہفتے کے چھ دن تو کام میں لگا رہتا۔ ساتویں دن

اپنے پیروؤں کے ساتھ خفیہ ملاقات کرتا۔اس طرح اس کا پیام دھیرے دھیرے دوروزنزدیک پھیلتا رہا۔

کاؤس کو کھلونے والے کے ساتھ رہتے ہوے چند دن اور گذر گئے ۔ایک دن کھلونے والے نے صبح ناشتے پر کاؤس سے کہا۔'' آج میں اپنے کام سے چھٹی لیتا ہوں۔تم اپنے کام پر نکل جاؤ۔یا تم بھی چھٹی لینا چاہوتو اپنے کمرے پر رہو یا جو جی چاہے کرو۔اب ہم لوگ شام ہی کو واپس لوٹیں گے۔''
یہ کہہ کر کھلونے والا اپنے کمروں کو مقفل کرتے ہوے اپنی بیوی کے ساتھ گھر سے روانہ ہو گیا۔
کاؤس کو پہلے سے کوی اندازہ نہ تھا کہ اسے ایک پورا دن اس طرح تنہا گذارنا پڑے گا۔اُس نے زیادہ تر اپنے کمرے میں رہنا اور طوطے اور بندر کے ساتھ گذارنا پسند کیا۔تنہا ہونے کی وجہ اُسے بندر کے ساتھ ریہرسل کا ایک موقع بھی مل گیا۔بندر ریہرسل میں پورا اُترا۔کاؤس کو پھر ایک بار اطمینان ہو گیا کہ وقت آنے پر بندر سے چوک نہ ہوگی۔کھلونے والا رات دیر گئے اپنی بیوی کے ساتھ لوٹا، پھر ان تینوں کی ملاقات صبح ناشتے پر ہی ہوی۔کھلونے والے کی زندگی کا ایک اور پراسرار باب کاؤس کے سامنے آ گیا۔
اُس نے اگلے ہفتے کا انتظار کیا۔ساتویں دن پھر وہی ہوا۔کھلونے والے نے کاؤس کو ناشتے کے بعد پھر خدا حافظ کہا۔کاؤس کی بے کلی بڑھتی گئی۔اگلی بار ساتویں دن کاؤس نے اپنے طوطے اور بندر کے لیے دن بھر کے کھانے پانی کا انتظام کر دیا اور جب ناشتے کے بعد کھلونے والا اور اُس کی بیوی گھر سے نکلے تو کاؤس بھی چھپتے چھپاتے اُن کی ٹوہ میں روانہ ہوا۔ایک مقام پر کھلونے والے نے اپنی بیوی کو الوداع کہی اور اُسی مقام پر ملنے کا وعدہ کر کے آگے بڑھ گیا۔چلتے چلتے آبادی جب ختم ہونے کو آی اور سناٹا ہو گیا تو کھلونے والے نے اپنے کرتے کی جیب سے ایک آلہ نکالا۔آلہ کو موبائیل فون کی طرح استعمال کرتے ہوے اُس نے کسی سے چند منٹ بات کی۔پھر تیزی سے اُسے بند کر کے واپس اپنے جیب میں رکھ لیا۔اس کے بعد وہ کچھ دور جا کر ایک ویران عمارت میں داخل ہو گیا۔کاؤس جو چھپ چھپ کر اتنی دور تک اس کا پیچھا کر رہا تھا ایک شکستہ دیوار کی آڑ میں ہو گیا۔اُس کی نظریں ویران عمارت کے داخلے پر لگی رہیں۔
تھوڑی ہی دیر بعد دو نوجوان اِدھر اُدھر دیکھتے ہوے ویرانے کے اندر داخل ہو گئے۔کاؤس بچتا بچاتا ویرانے کی دیوار سے لگ کر کسی طرح ایک روشن دان تک پہنچ گیا۔اندر دیر تک تین آدمی باتیں کرتے ہوے نظر آے۔کچھ آوازیں سنای دیں اور بعض جملے کہیں کہیں سے سمجھ میں آ گئے۔تھوڑی دیر بعد دو اور آدمی آے تو پہلے کے آے ہوے نوجوان واپس ہو گئے۔معاً ایک اور شخص آیا۔چاروں محوِ گفتگو ہو گئے۔

اس کے بعد باہر سے آئے ہوئے تینوں آدمی چلے گئے تو کھلونے والے نے ویرانے کی ایک دیوار پر چاک سے کچھ نشان بنائے اور اس کے بعد وہ خود بھی وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اُس کے چلے جانے کے بعد کاؤس ویرانے کے اندر داخل ہوا۔ دیوار پر چاک سے بنائی ہوئی لکیروں کے سوا اُسے وہاں کچھ نظر نہیں آیا۔ البتہ اُس نے اُن لوگوں کی دو چار باتیں سن لی تھیں ان سے اسے اندازہ ہو گیا کہ اصلیت کیا ہے۔ یہاں سے نکل کر شام ہونے سے قبل کاؤس اپنے کمرے پر پہنچ گیا۔ آج کی رات اُس پر بہت بھاری تھی۔ اتنے برسوں تک دن رات کے اضطراب کی بات الگ تھی اور آج کی کیفیت کچھ اور۔ کاؤس نے ساری رات جاگتے اور سوچتے میں گذار دی۔ صبح ہوئی اور ناشتے کا وقت آ گیا تو کھلونے والے کے کمرے میں جاتے ہوئے اس دفعہ کاؤس نے طوطے اور بندر کو بھی ساتھ لے لیا۔ کھلونے والے نے کاؤس کے ساتھ جب طوطے اور بندر کو دیکھا تو ایک ہلکی سی مسکراہٹ اُس کے چہرے پر آ گئی۔

''میں آج ناشتہ نہیں کروں گا۔'' اندر آتے ہی کاؤس نے اعلان کیا۔ کھلونے والا اور اُس کی بیوی تھوڑی دیر تک اُس کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر ناشتہ کرنے میں لگ گئے۔ کاؤس نے طوطے کو پنجرہ سے نکالا اور کھلونے والے سے مخاطب ہوا۔

''اب تک کوئی یہ نہیں جان سکا کہ میرے بیٹے کا قاتل کون ہے۔ میں اپنے مشن میں ناکام ہو چکا ہوں۔ تم اپنا مشن جاری رکھو۔ میرا تو المیہ یہ ہے کہ میں اپنی برادری تک تمہارا پیام بھی نہیں پہنچا سکتا۔''

یہ کہہ کر کاؤس نے بندر کو اپنے قریب کیا اور اپنا دایاں ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیا۔ بندر نے جو کاؤس کے ہاتھ کی طرف نظریں جمائے بیٹھا تھا آناً فاناً پستول داغ دیا۔ کاؤس کا ہاتھ بدستور اُس کے سر پر ہی رہا۔ گولیاں چلتی رہیں یہاں تک کہ پستول خالی ہو گیا۔ کاؤس کو خون میں لت پت دیکھ کر بندر کے ہاتھ سے پستول چھوٹ گیا۔ پھر وہ تھوڑی دیر تک اِدھر سے اُدھر کودتا رہا۔ آخر میں اُچک کر دیوار کی منڈیر پر جا بیٹھا۔

بندر کے اُچھل کود کی وجہ سے طوطے کے پاؤں کی ڈوری کئی بار کھنچ گئی۔ وہ بار بار چیختا رہا ''تیری قسمت کا حال میرے پنجے میں! - تیری قسمت کا حال میرے پنجے میں! - تیری قسمت..........!'' آخری بار طوطا اپنا جملہ پورا کیے بغیر اپنی جگہ سے اُڑا اور ایک درخت کی ٹہنی پر جا بیٹھا۔ اُس کے پنجے کی ریشمی ڈوری لٹکتی رہ گئی۔

❖ ❖ ❖

پرسہ

کتنے نادان اور کیسے مورکھ ہو تم!

تم نے میرے ساتھ کتنی صدیاں نہیں گذاریں!

سب کچھ جان کر تم کیا چاہتے تھے؟ تمہارے دل کی بات کا تو مجھے علم ہی نہ ہو سکا۔ شاید تم چاہتے تھے کہ وہ بات بھی میں ہی کہوں جو تمہارے دل میں ہے۔ کیسے مرد ہو؟ میں تو تمہیں بے حد چاہتی تھی۔ اسی لیے میں نے اپنی ساری انا کو کچل ڈالا اور اُسے تمہاری جھولی میں ڈال دیا۔ تمہاری جھولی خالی تھی۔ میں نے کہہ دیا کہ ''میں تم سے بیاہ کروں گی'' تم نے اپنی سپر ڈال دی اور مجھ سے بیاہ رچالیا۔

لیکن بیاہ کے چند ہی دنوں بعد میں نے تم میں تبدیلی محسوس کی۔ پہلے تم مجھ سے ایک دوست کی طرح ملتے تھے، اس وقت تم اکیلے ہی تھے۔ بیاہ کے بعد تم اکیلے نہیں رہے۔ تمہارے کتنے ہی رشتہ دار ہمارے بیچ میں آگئے اور تم نے چاہا کہ میں ان سب کی بڑائی کروں۔ میں نے تو اپنے ماں باپ اور اپنے بزرگوں کا بھی اُسی حد تک خیال رکھا جس حد تک یہ مجھ سے محبت کرتے تھے۔ تم نے اپنی ساری انصاف پسندی کو بالائے طاق رکھ دیا اور حق ناحق پر اپنے ہی لوگوں کی طرف داری کرتے رہے۔ تم نے یہ نہیں سوچا کہ حالات بدل جاتے ہیں، احساسات متاثر ہوتے ہیں تو رشتوں کی مساوات اور نوعیت میں بھی فرق آجاتا ہے۔ تاہم میں نے تمہارے معاملے میں ایسا کچھ ہونے نہیں دیا۔ سارا دُکھ میں نے جھیلا، تمہارے

اس گھمنڈ کو مجروح ہونے نہیں دیا کہ میں تم پر فخر کرتی ہوں۔ کسی احساس کا ایک بھرم اور ایک اعتبار بھی ہوتا ہے۔ اس بھرم اور اعتبار پر میں نازاں رہی۔

تم اس بات سے اچھی طرح واقف ہو کہ شادی سے پہلے تم اکیلے مرد ہی میری فہرست میں نہیں تھے۔ کوئی نصف درجن نوجوان اس میں شامل تھے۔ لیکن تم نے مجھ سے ایک لمحہ ایسا چرالیا تھا کہ اس کے بعد میں نے اس فہرست میں صرف تمہارا نام رکھا اور باقی سارے نام اس سے خارج کر دیے۔

ایک دن ہماری شادی سے بہت پہلے تم اور میں پا پیادہ آبادی سے ذرا دور نکل گئے تھے۔ شام کا وقت تھا، آسمان پر ملگجی اُجالا اور سنہرا رنگ تھا۔ دور ایک کھنڈر نما محل دکھائی دیا۔ ہم چلتے چلتے اُس محل کے قریب پہنچ گئے۔ محل کی چھت کہیں کہیں سے گری ہوئی تھی، دیواریں خستہ تھیں، کھڑکیاں ٹوٹی ہوئی، دروازے غائب تھے۔ ہم اندر داخل ہونے ہی والے تھے کہ پیچھے سے کسی کے دوڑتے ہوئے آنے کی آہٹ ہوئی۔ ایک ہٹہ کٹہ مسٹنڈا ہمارے قریب پہنچ چکا تھا۔ آتے ہی اس نے تمہارے منہ پر زوردار مکا مارا، میری طرف آگے بڑھا۔ تم بیچ میں آگئے، اپنی پوری طاقت سے اس کی کلائی پر ہاتھ مارا۔ اپنا پنجہ نیچے ڈھلتا ہوا دیکھ کر اس نے کہا تھا۔ ''ایک بار اس عورت سے ملنے دے، میں تم دونوں کو چھوڑ دوں گا''۔ یہ سن کر تم غیظ و غضب میں چیخنے لگے۔ ''حرامزادے کیا سمجھ رکھا ہے۔ یہ میری بیوی ہے۔ تو نے ذرا بھی آگے بڑھنے کی ہمت کی تو تیرا خون پی جاؤں گا۔'' یہ کہتے ہوئے تم نے اپنی پوری طاقت سے اسے دبوچ لیا اور مجھ سے کہا کہ میں آبادی کی طرف چل پڑوں۔ جب میں آبادی کے قریب پہنچ گئی تو تم ہانپتے ہانپتے آ کر مجھ سے ملے۔ یہی وہ لمحہ تھا جو تم نے مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چرالیا۔

اس وقت تو میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں، زندہ رہتی تو تمہارے ہی ساتھ رہتی۔ تمہیں اس بات پر دکھ ہے کہ تم نے مجھ سے کبھی پیار کی باتیں ہی نہیں کیں۔ اب میں تمہاری سب سے زیادہ چہیتی اور پسندیدہ شخصیت بن گئی ہوں۔ چلو تم نے اچھا ہی کیا۔ نہ بیاہ سے پہلے کوئی اظہار کیا، نہ ہی اس کے بعد کبھی پیار کے دو بول بولے۔ یہ سوچ کر عجیب سا لگتا ہے کہ ہماری (۳۷) سینتیس سالہ ازدواجی زندگی میں تم نے کئی دوسری عورتوں سے اپنے پیار کا اظہار کیا۔ ان میں چند ایسی بھی تھیں جنھوں نے اپنے شوہروں کو مطیع بنا کر رکھا تھا، میں نے کبھی نہیں چاہا کہ تم میرے مطیع بن کر رہو، تمہارا یہ وصف مجھے بہت پسند تھا کہ نہ تم کسی کے مطیع ہو سکتے ہو اور نہ ہی کسی کو مطیع بنانا چاہتے ہو۔ تم نے مجھے ہر طرح سے بے نیاز ہی رکھا، لیکن تمہارے رومانس کے بہت سے قصے سننے میں آتے رہے۔ آنکھوں سے دیکھا بھی۔ ان سے میں پہلے سے واقف

تھی لیکن تمہارے بدلے ہوئے رویے کے بارے میں مجھے حیرت ہوی ۔ شادی کے بعد مجھ سے اکثر بے گانہ سے رہے ۔ واقعہ یاد دلاتی ہوں ، ایک دن میری ماں کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا تھا ۔ ہم دونوں ساتھ تھے ۔ واپسی پر میں ماں کے ساتھ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی ۔ ہم لوگوں نے طے کیا تھا کہ ماں کو گھر پہنچا کر رات کا کھانا کسی رسٹورنٹ میں کھائیں گے ۔ گھر پہنچ کر ماں کے ساتھ میں بھی کار سے اُتر پڑی کہ اگلی سیٹ پر تمہارے ساتھ بیٹھ جاؤں ۔ کار کا پچھلا دروازہ بند کیا ہی تھا کہ تم فرآٹے کے ساتھ نکل پڑے ۔ ہوٹل پہنچ کر تم نے مجھے غائب پایا اور گیٹ کیپر سے پوچھتے رہے کہ تمہاری کار سے کوی عورت اُتری تو نہیں ، جب تمہیں پتہ چلا کہ گیٹ کیپر نے تمہاری کار سے اُترتے ہوے کسی عورت کو دیکھا ہی نہیں ہے تو تم نے گھر فون کیا ۔ ایسی حرکت تم نے پہلی بار نہیں کی تھی ۔ میں نے تم پر کبھی غصہ نہیں کیا ۔ صرف افسوس کیا ۔

ایک اور واقعہ بھی یاد آ گیا ۔ اسے یاد کرتے ہوے ہنسی بھی آتی ہے ۔ ان دنوں ہمارے پاس موٹر سیکل تھی جو تمہارے دوستوں میں لال جاوا کے نام سے مشہور تھی ۔ اس لیے نہیں کہ تم اس پر بیٹھ کر سارے شہر میں گھومتے اور دوستوں سے ملنے جایا کرتے تھے بلکہ اس لیے کہ اس پر لڑکیوں کو بٹھا کر سڑکوں پر سے گذرنے کے بجائے گلیوں کی راہ لیتے تھے ۔ مجھے اس کی بھی پروا نہیں تھی ۔ جب اس بات کا چرچہ ہونے لگا تو میں نے بات چھیڑی ۔ تم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ۔ اُسی وقت مجھے موٹر سیکل پر بٹھا کر کسی قومی شاہراہ پر چل پڑے ، شام سے رات ہوگئی ۔ تم گاڑی چلاتے ہی رہے ۔ ہم جب ایک جنگل سے گذرنے لگے تو کچی سڑک پر موٹر سیکل پھسل پڑی اور ہم دونوں گر پڑے ۔ گرتے ہوے تم نے مجھے اپنے کاندھوں کا سہارا دیا تھا ۔ تمہارے گھٹنے زمین سے گھسٹ کر لہولہان ہو گئے تھے ۔ جنگل سنسان تھا ، جھینگروں اور کیڑوں کی آوازیں آ رہی تھیں ، کسی بھی سمت سے ڈاکو اور لٹیرے ہم پر جھپٹ پڑ سکتے تھے ۔ میں نے اپنا نکلس گلے سے اُتار کر چھپا لیا تھا ، تم نے موٹر سیکل کو سڑک کے کنارے کھڑا کیا ۔ اس وقت تم نے مجھے اپنے سینے سے چمٹا کر صرف اتنا کہا تھا ’’ گھبراؤ نہیں ۔ ہمیں کچھ نہیں ہوگا ۔ ‘‘ کچھ ہوا بھی نہیں ۔ لیکن میں اس واقعے کو کبھی بھولی نہیں ۔

بہت سی خوشگوار یادیں بھی تمہارے ساتھ وابستہ ہیں ۔ ان میں ایک واقعہ ہمارے پاکستان کے ویزا حاصل کرنے کا بھی تھا ۔ پہلی بار ہماری درخواست پر پاکستان کے سفیر نے لکھا کہ ویزا خاص حالات ہی میں جاری کیا جاتا ہے ۔ ’’ کوی عزیز شدید بیمار ہو یا رحلت کر جاے ۔ ‘‘ تم نے جواب دیا ہم لوگوں کی یہ کیسی بدنصیبی ہے کہ ہم اپنے پاکستانی کسی عزیز یا رشتہ دار سے ملنا چاہیں تو اس کی بیماری یا رحلت کی خواہش

کریں۔ سفیر موصوف سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ چند برسوں بعد جب دونوں ملکوں کے حالات ٹھیک ہوئے تو مجھے حیرت ہوئی کہ صرف دو دن میں تم نے ہمارے حیدرآباد، بمبئی اور کراچی سے ہو کر ملتان جانے کا انتظام کر دیا۔ پاکستان ایمبسی کے ایک کلرک نے تم پر طعنہ کسا کہ صرف گھنٹے بھر میں اس طرح پہلے کسی عام شہری کا ویزا تیار نہیں ہوا۔ تم نے پینے کے لیے پانی مانگا تو اس نے بے محل کربلا کا حوالہ دیا۔ تم سے رہا نہ گیا "جناب یہ نہ بھولیے گا کہ کب کس کے ساتھ کربلا جیسا واقعہ ہو سکتا ہے۔" ان لوگوں نے چپ چاپ ویزا تمہارے ہاتھ میں پکڑا دیا اور اس طرح سے میری اور ہمارے بچوں کی مراد پوری ہو گئی۔ میں اپنی بھتیجی کی شادی میں اپنے بچوں کے ساتھ ٹھیک وقت پر پہنچ سکی۔

اب زندگی کے گوناگوں واقعات پر غور کرتی ہوں تو میری کوئی بڑی مُرادیں نہیں تھیں، صرف دو معمولی سی مرادیں تھیں۔ کسی طرح میں میڈیکل ڈاکٹر بن جاؤں اور تم سے بیاہ کرلوں۔ عام لوگوں کے لیے یہ چھوٹی سی مرادیں ہو سکتی ہیں لیکن میرے لیے اس سے بڑی مرادیں کوئی اور نہیں تھیں۔ یہ مجھے حاصل ہو گئیں۔ سوچتی ہوں کسی اور طرح کی زندگی کی تمنا کرتی تو وہ کیسی ہوتی۔ کبھی کبھی چھوٹی سی مرادیں پوری ہو جاتی ہیں تو وہ کسی تمغے یا ایوارڈ سے بہت بڑی ہوتی ہیں۔ ایسے تمغے یا ایوارڈ جن کی خواہش نہ کی جائے، اگر وہ حاصل ہو جائیں تو ان کی وقعت ہی کیا! مجھے جو کچھ حاصل ہوا اسے پا کر میں مگن ہی رہی اس لیے کہ جو تمنا کی تھی وہ میں نے پالی۔

بعض واقعات کا دُکھ مجھے ضرور ہے، وہ نہ ہوئے ہوتے تو اچھا تھا۔ کہے دیتی ہوں کہ میرے دل کا بوجھ بھی ذرا ہلکا ہو جائے۔ میں نے تمہاری بعض حرکتوں پر احتجاج کیا تھا، ایک بار کسی بات پر تم نے دھمکی دی تھی کہ دوبارہ بحث کروں تو تم مجھے سزا دو گے۔ ویسے مجھ میں دوسری عورتوں کی طرح بحث کی عادت بھی نہیں تھی۔ اس دن تمہیں کیا ہو گیا تھا کہ سچ مچ تم نے مجھ پر ہاتھ اُٹھا دیا۔ میں کوئی ایسی عورت تو تھی نہیں کہ تمہاری اس حرکت کو برداشت کر لیتی۔ میں نے بھی تمہارا دامن پکڑ لیا اور تمہیں اس طرح جھنجھوڑا کہ اندر سے تمہارا بنیان چاک ہو گیا۔ تمہارا اُٹھا ہوا ہاتھ جہاں تھا وہیں رُک گیا تم اس پر ہمیشہ پچھتاتے رہے کہ تم نے ایسی حرکت کیوں کی تھی۔ بار بار یہ کہنے لگے کہ

"He is the lowest of the low, who raises his hand

upon a women, save in love".

لیکن بندوق سے نکلی ہوئی گولی اپنا کام کر جاتی ہے۔ وہ تو صرف جسم کو زخمی کر سکتی ہے لیکن کسی کو

دی ہوی گالی یا کسی پر اُٹھایا ہوا ہاتھ جسم سے زیادہ دلوں میں سوراخ چھید دیتا ہے .... چلو میں نے تمہیں اس موقع پر بھی معاف کیا۔

کبھی کبھی تم اپنی عجلت پسندی کی وجہ کچھ بھی کر گذر جاتے اور لوگوں کو حیرت میں ڈال دیتے۔ ایک بار میرے ساتھ بھی تم نے بڑی عجیب وغریب حرکت کی۔ ایک معمولی سے واقعے پر مجھے ایک طلاق دے دی۔ میں دنگ رہ گئی۔ بڑا دُکھ بھی ہوا۔ اُس کے بعد تم مجھ سے دنوں تک منہ چھپاتے رہے۔ مجھے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی کیوں کہ تم خود ندامت کے بوجھ تلے دبے جارہے تھے۔ تم اسے بھول جانا چاہتے تھے لیکن مرد کا یہ ایک جرم ایسا ہے جسے عورت کبھی نہیں بھولتی۔ ہمدردی سمجھو کہ تم سے بے پناہ چاہت کا سبب یقین تھا کہ تم مجھے طلاق دے کر اکیلے زندگی نہیں گذار سکتے اور نہ ہی کسی دوسری عورت کے ساتھ نباہ کر سکتے ہو۔ مشکل سے چار پانچ ہفتے نہیں گذرے تھے کہ ایک رات تم چپکے سے میرے بستر میں گھس آے۔ میں نے تمہیں ہمیشہ کی طرح اپنا لیا۔ شکست خوردہ سپاہی کو پناہ دے کر اُس سے التفات سے پیش آنے کی بھی ایک لذت ہوتی ہے۔ اُس رات میں اُسی طرح کی لذت سے ہمکنار ہوی۔ تم نے یا تو بہانہ کیا تھا یا میری بے ریا شخصیت کو آزمانا چاہتے تھے۔ جو کچھ ہو جیت میری ہوی۔

خفا نہ ہونا تمہیں ایک بات یاد دلاتی ہوں۔ تم نے میری الماری سے پیسے نکالے تھے۔ ایک دن بیٹے نے تمہیں الماری میں نقلی چابی گھماتے دیکھ لیا تھا۔ چابی کو تم الماری سے نکالنا بھول گئے۔ تم جب کمرے سے باہر جاچکے تو بچہ وہ چابی لے کر میرے پاس دوڑا دوڑا آیا۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ چابی تو تمہارے ڈیڈ کی ہے۔ تم اسے کیوں لے آے۔ جاؤ اسے واپس کردو۔ پھر تم نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی کہ تمہیں مجھ سے قرض مانگتے اچھا نہیں لگتا۔ ضرورت پڑنے پر تم الماری میں سے پیسے نکال لیتے ہو اور پھر پیسے آنے پر چپکے سے واپس رکھ دیتے ہو۔ مجھے کیا معلوم کہ تم نے کتنی بار الماری سے پیسے نکالے اور کتنی بار واپس رکھ دیے۔ میں اپنی روز کی آمدنی کا حساب تو نہیں رکھتی تھی اور پھر قرض لینے کا یہ کونسا طریقہ ہے؟ میں نے تمہاری بات سن لی۔ میرا چپ ہو جانا بھی تمہیں اچھا نہیں لگا، تم نے نقلی چابی مجھے دے دی کہ آئندہ تمہیں پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔

سب سے زیادہ برا وقت تو مجھ پر تب پڑا تھا جب تم دوسرے ممالک کے سفر پر روانہ ہو گئے تھے۔ یہ نہیں بتایا کہ کتنے عرصے بعد لوٹو گے۔ ہفتے دو ہفتے میں کبھی کبھی فون کر دیا کرتے۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ تم نے تین مہینوں تک اپنی کوی خبر ہی نہیں دی۔ تمہارے دوست مجھ سے ملنے آتے تو طعنہ دے جاتے

کہ اب تم واپس نہیں آؤ گے۔ میں تمہارے دوستوں سے تمہارے خلاف بہت سی باتیں سنتی رہی تھی۔ لیکن میں تمہارے فون کا انتظار کرتی رہی اور جب ایک صبح تمہارا فون آیا تو میں نے صرف اتنا کہا تھا۔ ''بہت ہو چکا۔ اب چلے بھی آؤ۔''

تم آگئے تو میں نے تم سے کوئی شکایت نہیں کی، تمہارے ساتھ ہمیشہ کی طرح رہنے لگی۔

تمہاری اس طرح کی مہموں کا ذکر کرتے ہوئے مجھے وہ لمحے بھی یاد آتے ہیں، جب تم میری طرف داری میں کسی سے بھی بھڑ جاتے تھے۔ ایک بار تمہارے ایک واقف کار نے فون پر مجھ سے بدتمیزی سے بات کی۔ اتفاق سے دوسرے ہی دن وہ ہمیں سڑک پر اپنی اسکوٹر پر جاتا ہوا دکھائی دیا۔ تم نے اس کا پیچھا کیا اور اپنی کار کو اس کی اسکوٹر کے سامنے لا کھڑا کیا اور ڈانٹنے لگے۔

''تم نے میری وائف سے کچھ کہا تھا۔ مرد ہو تو مردوں کے سامنے بات کرو۔'' اتنا سن کر اس نے اپنی اسکوٹر اسٹارٹ کر دی اور اس سے قبل کہ تم اور کچھ کہتے وہ وہاں سے بھاگ نکلا اور پھر کبھی نظر نہیں آیا۔

بات بہت پرانی ہے۔ ایک دن تمہاری خالہ نے مجھ سے کہا تھا۔ ''اپنی ساس کا خیال رکھنا۔''

وہ کون ہوتی تھیں مجھ سے کہنے والی۔ میں نے تم سے شکایت کی۔ تم ان معاملات میں ہمیشہ ہی بڑے کھرے ثابت ہوئے۔ مجھے اچھا لگا جب تم نے اپنی خالہ سے پوچھا۔

''آپ کون ہوتی ہیں میری بیوی اور میری ماں کے بیچ بولنے والی۔ کچھ کہنا ہی تھا تو مجھ سے کہتیں!''

اس کا سارے خاندان میں بڑا چرچہ ہوا۔ پھر کسی نے مجھ سے کبھی کچھ نہیں کہا، ان باتوں کے علاوہ میں تمہیں اکثر لکھتا پڑھتا دیکھ کر ہمیشہ خوش ہوا کرتی۔

ایک دن تمہارے ایک دوست ڈرامے کے ڈائرکٹر نے ایک ڈرامہ ہمارے گھر کے لان پر پیش کیا تھا۔ سب نے بہت پسند کیا۔ اس کے بعد تمہارے دوست کو یہ احساس ہو گیا کہ میں ڈراموں کی سرپرست ہوں۔ پھر ہم لوگوں نے جس قدر بن پڑا ڈراموں کی سرپرستی کی۔ یہی وجہ ہوگی کہ میرے مرنے کے دوسرے ہی دن تمہارے اسی دوست نے ڈرامے کا ایک شو میرے نام معنون کیا ژاں ژینے کا ڈرامہ 'Death Watch' تم نے اس کا ترجمہ ''موت کا چہرہ کیا تھا۔'' صرف چالیس گھنٹے قبل تم موت کے چہرے کو بہت ہی قریب سے دیکھ چکے تھے۔ میری روح کو اپنی اُنگلیوں میں سے گذرتا ہوا تم نے محسوس کیا تھا۔ اب اسٹیج پر کیا دیکھنے گئے تھے۔ باٹنا چاہتے تھے یا پھر دوسروں کے غم کو اپنے غم میں شامل کرنا چاہتے تھے، دل کی باتیں بڑی مشکل سے جانی جاتی ہیں۔ لیکن ان چالیس گھنٹوں میں تم بہت روئے تھے۔ اب

بھی اتنے دنوں بعد تم بار بار رو پڑتے ہو۔ تمہاری آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ تم جیسا سخت جان اور مضبوط دل رکھنے والا آدمی اس طرح رو سکتا ہے۔ مجھے احساس ہے کہ تم نے میری دلجوئی بھی کی ہے۔ گذشتہ چند برسوں سے پتہ نہیں تم اتنے کیوں بدل گئے تھے۔ میرے ساتھ ہی ناشتہ کرنا، چھوٹے بڑے کاموں میں میرا ہاتھ بٹانا، باہر جاتے ہوے کہہ کر جانا کہ تم کہاں جا رہے ہو اور کب تک لوٹو گے۔ شام کے کھانے پر میرے ساتھ شریک رہنا۔

تمہیں اس طرح اپنے اردگرد منڈلاتے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی۔ ہمارے بچے بھی اب بڑے ہو گئے تھے۔ اب تمہیں ان کے بسانے کی فکر لگی تھی اپنے لڑکے کو یم ۔ ڈی کرانے کی فکر، اس کی شادی کی فکر اور اپنی لڑکی کے بچوں کی پڑھای کی فکر بھی، اور نہ جانے کیا کیا سوچنے لگ گئے تھے تم۔

میں تو اچھی خاصی صحت مند ہی تھی۔ پتہ نہیں میرے دل کو کیا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کہنے لگے کہ ذرا پھیلنے لگا ہے۔ اس کا علم کسی کو نہ تھا۔ میں نے شبہ ضرور کیا تھا لیکن اس کا ذکر کسی سے نہیں کیا۔ دھکہ تو اس وقت لگا جب قلب پر پہلی بار حملہ ہوا تھا۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ خطرہ ٹالا جا سکتا تھا۔ لوگ ایسے حملوں کے بعد بھی دس بیس برس زندہ رہتے ہیں۔ اس حملے کے بعد شاید تمہیں پہلی بار محسوس ہوا کہ میرے ساتھ کبھی بھی کچھ ہو سکتا ہے۔ میں تمہاری بے چینی کو محسوس کرنے لگ گئی تھی۔ تم میرے ساتھ بہت کم باہر نکلنے والے اب ہر بار ڈاکٹر کے پاس خود ہی لے کر جانے لگے تھے، تین مہینوں کے علاج سے حالت بہتر نہ ہوی تو تم نے ڈاکٹر کو بدلنے کی بھی بات کی۔ پھر دو دو ڈاکٹروں کو لگایا۔

آہستہ آہستہ میری غذا بہت کم ہو چکی تھی۔ جسم کی کمزوری بڑھنے لگی۔ چلنے میں پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ ڈاکٹروں اور دواخانوں کی آمد و رفت بڑھ گئی۔ اس دوران تم نے اپنا اور میرا حوصلہ قائم رکھا۔ ڈاکٹر کے بدلنے کے بعد اُمید بندھ گئی کہ پیس میکر (Pace Maker) لگا دیا جاے گا اور اس کے بعد میں برسوں زندہ رہ سکوں گی۔ لیکن آخری چند دنوں میں تمہاری بوکھلاہٹ بڑھ گئی تھی۔ کبھی راتوں میں تم سے میں کہتی کہ مجھے بھوک لگی ہے۔ تم فوراً اُٹھ کر بڑی مستعدی سے میرے سامنے غذائیں رکھ دیتے۔ میں تو نوالے دو نوالوں سے بڑھ کر کھا نہیں سکتی تھی۔ میرے کمزور لہجے پر تمہارے چہرے پر افسردگی چھا جاتی جسے دیکھ کر میں بھی دُکھی ہو جاتی۔ دُکھ مجھے اپنے مرنے کا نہیں بلکہ تمہاری تنہای کے بارے میں سوچ کر ہوتا ہے پھر وہ دن بھی آیا کہ تم میری آخری سانسوں کی آواز پر جاگ پڑے تھے۔ میرے چہرے پر سے اپنی اُنگلیاں پھیرتے ہوے تم میرے نام سے مجھے بلاتے رہے۔ صرف آخری چار سانسیں تھیں۔ میں بے بس

تھی، تمہاری بات کا جواب نہ دے سکتی تھی۔ تم نے محسوس کرلیا تھا کہ میری روح تمہارے داہنے ہاتھ کی اُنگلیوں کی ساندوں سے ہوکر گذر رہی ہے۔ آخری سانس اکھڑ گئی تو تمہاری آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور تم پلنگ کے اردگرد چکر لگا رہے تھے۔ پھر تم نے بیٹے کو آواز دی، ڈاکٹر کو بلالیا۔ اس نے تصدیق کردی کہ اب اس دُنیا سے میرے سارے رشتے ٹوٹ چکے ہیں۔

تم نے جس دن سے حیدرآباد میں قدم رکھا تھا، میں نے تمہاری رفاقت نبھائی تھی۔ اس وقت بھی جب تمہارا اس شہر میں کوئی نہ تھا اور اس وقت بھی جب تمہارے چاہنے والوں کی کثرت ہوگئی تھی۔ لیکن ان لوگوں میں چند احباب تو دوسرے ملکوں کو ہجرت کر چکے تھے۔ چند اللہ کو پیارے ہوگئے تھے۔ ایسے میں تمہیں میری رفاقت کی ضرورت تھی۔ لیکن یہ ہمارے اختیار میں کہاں! اب تمہیں بار بار آنسو بہاتا دیکھ کر مجھ سے رہا نہیں جاتا ہے۔ تم جب بھی باہر نکلتے ہو، سڑکوں اور گلیوں میں معمر جوڑوں کو دیکھتے ہو تو تمہارا دل مسوس کر رہ جاتا ہے۔ میں جانتی ہوں تم ان جوڑوں کی درازئ عمر کی دُعا کرتے ہو لیکن گھر لوٹ کر اپنی تنہائی پر آنسو بہاتے ہو۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہیں اپنی تنہائی سے زیادہ میری بے وقت موت کا گہرا دُکھ ہے۔ میری مسلسل جدوجہد اور محنت کے بارے میں تم بار بار لوگوں سے کہتے رہے ہو۔ یہی کہ میں نے ذرا بھی آرام نہیں لیا۔ اب میرے راحت پانے کا وقت تھا، یہ تم سوچتے رہتے ہو۔ لیکن میں نے کبھی ایسا سوچا ہی نہیں تھا۔ میں زندہ رہتی تب بھی آخر دم تک اپنے کام پر لگی رہتی۔ مجھے اپنے مریضوں سے اور اپنے پیشے سے بے حد پیار رہا ہے۔ یہ تم بھی جانتے ہو۔ ہاں ذرا ریلکس (Relax) کرنے کو جی چاہتا تھا۔ کیا تم نے سنا نہیں ہمارا پانچ سال کا نواسہ کہہ رہا تھا ’’نانی امیّ کو اللہ میاں نے اوپر بلالیا ہے۔ وہاں مریض بہت ہوگئے ہیں۔ اُن کا علاج ہونا ہے۔‘‘

ریلکس کرنا بہت کم ڈاکٹروں کے نصیب میں لکھا ہے۔ میری قسمت میں نہیں تھا۔ لیکن اس کا بھی مجھے افسوس نہیں ہے۔ میں صرف اس بات سے ملول ہوں کہ تم وقت بے وقت میری یاد میں آنسو بہانے لگے ہو۔ کبھی کبھی میرا من چاہتا ہے کہ میں تمہارے پاس آبیٹھوں۔ ایسے ہی جیسے میں تمہارے لکھتے پڑھتے وقت پاس آکر بیٹھ جایا کرتی تھی۔ لیکن کیا کروں یہ میرے بس میں نہیں ہے۔

میری رحلت کے تیسرے دن میں نے دیکھا کہ تمہاری بے کلی میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ سوچا چلو تمہیں اپنا دیدار کروادوں۔ میں نہیں جانتی کہ میں نے ایسا سوچا تھا یا تمہارے شدت غم کا کرشمہ کہ میں سفید اور مہین کپڑوں میں ملبوس تمہارے سامنے کھڑی تھی۔ میرے اطراف جو لوگ تھے تم اُنھیں پہچان نہ سکے۔

شاید تم کسی اور کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ تمہیں میری اور صرف میری ہی تلاش تھی۔ اتنی بے صبری تم نے پہلے کبھی نہیں دکھائی تھی۔ تم نے اپنا ہاتھ بڑھایا، میری طرف جھپٹ پڑے اور کہا:

''تم یہاں ہو اکبر!'' لیکن میرے نصیب میں بھی نہیں تھا کہ تمہارے ہاتھوں کا لمس محسوس کر سکتی۔ ہاں غسل کے بعد جب مجھے کفنایا گیا تھا تو تم نے میری پیشانی کو چھونا چاہا۔ لوگوں نے روکا کہ میّت کو اس طرح نہیں چھوتے۔ تم نے تو عام حالات میں بھی گناہ وثواب کی پروا نہیں کی تھی۔ غم واندوہ میں تم اس کی کیا پروا کرتے۔ تم نے مجھے چھو ہی لیا۔ لیکن اب میرے جسم کا وجود تو تھا نہیں کہ تم اُسے چھو سکتے۔ ادھر تمہارا ہاتھ آگے بڑھا اُدھر میں فضا میں تحلیل ہو کر تمہاری نظروں سے اُوجھل ہو گئی۔ تمہیں شاید ملول ہوا کہ تم نے ایسی بے صبری کیوں دکھائی تھی۔ خیر جو ہونا تھا وہی ہوا۔ جب تک میرے بس میں تھا، میں نے تمہاری پاسداری کی، تمہیں ہمیشہ خوش وخرم رکھا، اب تم سوائے صبر کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔ کوئی رشتہ دار اور کوئی دوست تمہارا ایسا نہیں جس نے تمہیں میری موت کا پرسہ نہ دیا ہو۔ کتنے لوگ تمہارے اس غم میں شریک نہیں ہیں۔ وہ جب بھی تمہارا غم بانٹنا چاہتے ہیں تو تمہاری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل جاتے ہیں۔ وہ تمہارا غم بانٹنا چاہتے ہیں اور تم اپنا غم بڑھا لیتے ہو۔ اس کے بعد اپنے احباب سے دُکھ پر قابو پانے کے لیے مشورہ کرتے ہو۔ قابو اس طرح پایا نہیں جاتا۔ ویسے میری مانو تو اسے قائم رکھو۔ یہ تمہیں نیکیوں کی طرف لے جائے گا۔

تمہارے وہ احباب مجھے اچھے لگتے ہیں جو تمہیں پرسہ دینے آتے ہیں تو چپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں۔ یا کچھ ایسی باتیں کر جاتے ہیں جو میری موت سے متعلق نہیں ہوتیں۔ ان کے علاوہ ایک دو جملے کہہ کر چپ ہو جانے والے بھی اچھے لگتے ہیں۔ حیرت تو مجھے ان لوگوں پر ہوتی ہے جو تمہیں پرسہ دینے کے لیے آتے ہیں اور اپنی بیماری اور علاج کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔ لیکن چلو یہ بھی تو تمہارے غم میں شریک ہیں اور آج تین مہینوں بعد میں بھی تمہارے غم میں شریک ہونے کے لیے آ گئی ہوں۔ اتنے دنوں سے مجھ سے تمہارا غم دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ میرے بعض احباب نے تم سے ٹھیک ہی کہا تھا کہ روتے ہوئے تم اچھے نہیں لگتے۔ مجھے بھی روتے ہوئے مرد بالکل پسند نہیں ہیں۔

جب کبھی تمہاری آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں ہو جاتے ہیں، تمہارے چہرے کی شکل بگڑ جاتی ہے۔ دیکھنے والوں کو اچھا نہیں لگتا۔ میں کبھی سوچ نہیں سکتی تھی کہ میرے بعد تم اپنے کو اس قدر تنہا محسوس کرو گے۔ اتنے بے کل ہو جاؤ گے۔ اسی لیے میں خود آج تمہیں پرسہ دینے کے لیے آئی ہوں۔ اب

تمہیں غم نہیں کرنا چاہیے۔تم نے اس کا انتظام بھی کرلیا ہے۔میرے پہلو ہی میں اپنے لیے جگہ محفوظ کروالی۔ یہ کیوں نہیں محسوس کرتے کہ اس وقت لکھنے بیٹھے ہوتو میں بھی تمہارے پہلو میں بیٹھی ہوں۔ میں زندہ تھی تو تب بھی تمہارے ساتھ تھی اوراب مرکر بھی تمہارے ساتھ ہوں۔کیا تمہیں اس بات کی طمانیت اورخوشی نہیں کہ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہی۔

✠ ✠ ✠

ساقی نعیم

ساقی نعیم کو سب ہی جانتے تھے۔ قصبے کے سارے لوگ اُس کے گن گاتے تھے۔ اُس کی مالا جپتے تھے۔ اُس کی ہر ادا سے واقف تھے اور مانتے تھے کہ وہ سب کا غمگسار اور بڑی عظمت والا ہے۔ اُس نے بچپن سے ابھی تک کوئی غلط کام نہیں کیا تھا۔ چند کام اپنے، چند کام خاندان کے اور باقی کام ملک وقوم کے۔ یہی اُس کا معمول تھا۔ اُس کے اپنے کاموں پر بہت کم وقت صرف ہوتا۔ اس کا سارا وقت کم وبیش اوروں کے لیے ہوتا۔ اسی لیے قصبے کے لوگوں نے اس کے نام کے ساتھ ساقی کا لفظ بڑھا دیا تھا۔ ساقی، وہ جو دوسروں کو پلاتا ہے۔

آج بھی دن بھر کے کاموں سے نبٹ کر اور تھک کر وہ بستر پر لیٹ گیا۔ اُسے بھوک نہیں تھی۔ نیند بھی نہیں آرہی تھی۔ آدمی درویش صفت ہو تو نہ اُسے کھانے کی فکر ہوتی ہے نہ سونے کی۔ نیند لانے کی اُس نے بہت کوشش کی۔ بڑے جتن کے بعد اُسے پل بھر کی نیند آئی۔ پھر وہ اُٹھ بیٹھا اور جب اُٹھا تو وہ بالکل ہی بدلا ہوا انسان تھا۔ اُس کے دونوں بازوؤں پر سنہری پر نکل آئے تھے۔ ہاتھ اور پاؤں کی اُنگلیاں، ہتھیلیوں اور پنجوں سمیت چوڑی اور چپٹی ہوگئی تھیں! یہ کیا ہوا؟ اس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کھڑکی کی طرف نظر پڑی تو آسمان پر تارے جھلملا رہے تھے۔ وہ اُٹھ کر باہر آیا۔ چاندنی زمین پر اپنا نور برسا رہی تھی۔ روشنی اتنی تیز تھی کہ وہ سامنے درخت کے پتوں کے اندر جھانک سکتا تھا اور درخت کی ٹہنیاں گن سکتا تھا۔ ساقی

نے بے چین ہوکر اپنے بازوؤں کو جنبش دی۔ اُسے لگا کہ وہ اُڑ سکتا ہے۔ وہ اُڑ کر درخت کی ایک ٹہنی پر جا بیٹھا۔ٹہنی نازک ہونے کے باوجود اس کا وزن سنبھالے ہوئے تھی۔ وہ پھدک کر چھوٹی سی چھوٹی اور نازک سے نازک ٹہنیوں پر جا بیٹھا۔آخر میں اُسے محسوس ہوا کہ وہ درخت کے کسی پتے پر بھی بیٹھ سکتا ہے۔اُس نے ایسا ہی کیا۔اُس کا وزن ہوا میں تحلیل ہو چکا تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ زمین پر آسکتا ہے یا نہیں اُس نے نیچے کی طرف چھلانگ لگائی اور زمین پر آرہا۔اُس کے قدم کھردری زمین پر پہلے کی طرح ٹک گئے۔اُس نے پھر سے ہوا میں جست لگائی اور آسمانوں کی سیر پر نکل پڑا۔وقت جیسے تھم گیا تھا۔

اُس نے سارے آسمانوں کی سیر کی۔ وہاں سے جی بھر گیا تو سمندروں کا رُخ کیا۔ایک ایک سمندر میں غوطہ لگایا اور اُن کی تہہ کو چھو آیا۔اس طرح اُس نے آسمان،سمندر،پہاڑ،جنگل،ریگستان دُنیا کے چپہ چپہ کی سیر کی اور اپنی جگہ پر واپس آگیا۔اس کے بعد ساقی نے اپنی مکمل طاقت اور وسعت کا اندازہ لگانا چاہا۔اب اُس پر یہ کھلا کہ اُس کے اندر ساری آسمانی قوتیں جمع ہوگئی ہیں۔ وہ کائنات کے کسی بھی حصہ تک پہنچ سکتا ہے اور کہیں جائے بغیر بھی وہاں کے حالات سے واقف ہو سکتا ہے۔ مزید آزمانے کے لیے اُس نے چاہا کہ وہ سورج بن جائے۔ وہ سورج بن گیا۔سورج بن کر ایک ہی وقت میں وہ ساری کائنات میں روشنی بکھیرنے لگا اور اپنی حرارت کو اس طرح پھیلایا کہ جہاں گرمی کی ضرورت ہو وہاں گرمی ہو اور جہاں معتدل آب و ہوا کی ضرورت ہو وہاں اعتدال ہو۔اُس نے یہ بھی اندازہ لگایا کہ وہ ایک ہی وقت میں کئی سورج بن کر پھیل سکتا ہے۔ وہ اپنی وسعت کا ابھی پوری طرح سے اندازہ لگا نہیں پایا تھا کہ قصبے کے لوگ دوڑے دوڑے، جوق در جوق اُس کے پاس آنے لگے۔ سامنے آکر کچھ لوگ ہاتھ باندھے کھڑے رہے۔ جو اور قریب آگئے تھے وہ سجدہ ریز ہو گئے۔ چند ایسے بھی تھے جو اُس کے قدموں پر گر پڑے۔اُسے یہ منظر عجیب سا لگا۔ وہ قصبے والوں سے مخاطب ہوا۔

''لوگو میں تم میں سے ایک ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ مجھ میں چند آسمانی طاقتیں سما گئی ہیں لیکن میں تمہارا ہی ہوں۔ مجھے غیر نہ جانو۔تمہارا اس طرح میرے سامنے جھکنا اچھا نہیں لگتا۔ میں تمہاری ضرورتوں اور حاجتوں سے واقف ہوں۔تمہارے کچھ کہے بغیر بھی میں اُنھیں پورا کرسکتا ہوں۔تم میں سے کوئی بھی شخص اس طرح اپنا وقت ضائع نہ کرے...... اچھا! جاؤ میں نے تمام حاجت مندوں کی ضرورتیں پوری کیں۔''

آخری جملہ ساقی نعیم کی زبان سے نکلا ہی تھا کہ وہاں موجود ہر شخص نہال ہو گیا۔اب کیا تھا آناً فاناً

قصبے کی باتیں شہر میں پھیل گئیں۔ شہروں سے نکل کر ملک میں اور پھر ملک در ملک ساقی نعیم کی شہرت ہو گئی۔ ساری دُنیا کی زبان پر صرف ساقی کا نام رہ گیا۔ چاروں طرف سے ''ساقی، ساقی'' کی آواز سنائی دینے لگی۔ ساقی نعیم وہاں آنے والوں کے دلوں کی کیفیت سے پہلے ہی واقف ہو جاتا۔ کسی کو اپنا مدعا پیش کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ ہر آنے والے سے کہتا۔ ''جاؤ، تمہاری حاجت پوری ہو گئی۔'' لوگ اپنی مراد پا لیتے اور خوشی خوشی وہاں سے لوٹ جاتے۔

اس طرح کئی دن، کتنے ہی برس اور کتنی ہی صدیاں بیت گئیں۔ ایک روز نعیم کو کچھ اور سوجھی۔ اُس نے ایک ایسی مشین بنا ڈالی جو جامِ جمشید اور ایچ۔ جی۔ ویلس کی ٹائم مشین سے بھی زیادہ انوکھی تھی۔ اس کے بعد وہ ہر آنے والے سے کہتا۔

''مجھ سے کسی بات کے طلب گار نہ بنو، اس مشین میں اپنی خواہشوں کو پورا ہوتا ہوا دیکھ لو۔ مجھے اچھا لگے گا کہ میرا نام لیے بغیر، مجھ تک پہنچے بغیر تم اپنی ساری مرادوں کو پا سکو۔'' اتنا کہہ کر ساقی نعیم لوگوں سے بے خبر ہو گیا۔ اب اُسے پورا یقین تھا کہ ساری دُنیا کے لوگ ہمیشہ ہمیشہ ایک جشن کی کیفیت میں رہیں گے۔

یہ سب ہو چکا تو ساقی نعیم کا جی چاہا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے ستا لے۔ ستانے کے لیے اُسے جگہ کی تلاش ہوئی لیکن ساری کائنات میں اُسے کوئی جگہ ایسی نظر نہیں آئی جہاں وہ تھوڑی دیر کے لیے آرام کر سکتا۔ اُس نے سوچا اب وہ اپنی مشین کو حکم دے گا کہ وہ روئے زمین کو وسعت دے اور ایسی جگہ بنائے جہاں سوائے اس کی ذات کے کسی اور کی رسائی نہ ہو۔ لیکن یہ سوچ کر اُسے خفت محسوس ہوئی کہ ابھی چند لمحوں قبل وہ اپنے آپ کو تمام مخلوقات کا ساتھی اور ہمدرد سمجھ رہا تھا اور اتنی جلدی وہ کیسے بدل گیا۔ شاید اُن سنہری پروں کا سبب تھا کہ اُس نے اپنے کو ساری مخلوق سے الگ کر لیا ہے اور اپنی ذات اور اپنے آرام کے لیے علاحدہ جگہ تلاش کر لی ہے۔

ابھی وہ پوری طرح سے تجزیہ کر نہ پایا تھا کہ ایک جوان اور بہت ہی کومل، بہت ہی حسین لڑکی ساقی نعیم کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتی ہوئی دکھائی دی۔ ساقی نعیم ایک لمحے کے لیے چونکا کہ کیا اُس نے اس معصوم لڑکی کے ارمان پورے نہیں کیے۔ اُس نے لڑکی کو آسمانی مشین کے اندر جھانکنے کے لیے کہا اور خود بھی کنکھیوں سے مشین کے اندر دیکھنے لگا۔ دونوں مبہوت ہو کر دیکھتے رہے۔ تھوڑی ہی دیر میں لڑکی کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوئے تو ساقی نعیم نے کہا۔ ''ذرا صبر کرو بی بی، خاطر جمع رکھو۔'' یہ کہہ کر اُس نے

مشین میں دیکھے گئے نوجوان کا دل پھیر دیا۔ اس کے بعد وہ مسکراتا ہوا لڑکی سے مخاطب ہوا۔ ''لو اب یہ نوجوان تمہارا ہو گیا۔'' لیکن وہ دوسری لڑکی جو اس نوجوان کے پہلو میں بیٹھی دکھائی دے رہی تھی اس بدلتے منظر کی تاب نہ لا سکی۔ اس نے ایک لمبی سانس لی۔ ایسی لمبی سانس کہ اُسے دوسری سانس لینا نصیب نہ ہوا۔ یہ ماجرہ دیکھ کر ساقی نعیم کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اُس نے اب تک طرح طرح کے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل حل کر دیے تھے لیکن پہلی بار اس واقعہ نے اُس کی آنکھیں کھول دیں اور وہ غور کرنے پر مجبور ہوا کہ اُس کی صلاحیتیں محدود ہیں۔ اُن میں بڑی کمی رہ گئی ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے میں اُس کی آسمانی مشین بھی کچھ مددگار ثابت نہ ہو سکتی تھی۔

پھر کچھ ایسے واقعات بھی سامنے آئے کہ ساقی نعیم اپنے کو بالکل بے بس محسوس کرنے لگا۔ وہ کسی ایک مسئلہ کو سلجھا دیتا تو وہی سلجھاؤ کسی دوسرے کے لیے زیادہ کٹھن مسئلہ بن جاتا۔ سب سے بڑا مسئلہ تو اُس وقت آ کھڑا ہوا جب ایک لحیم شحیم آدمی ساقی نعیم کے سامنے پیش ہوا۔ وہ اپنے دونوں بازوؤں میں اپنی ہی طرح کے دو دو آدمیوں کو تھامے ہوئے تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی بچہ اپنے ہاتھوں میں پلاسٹک کی گڑیاں تھامتا ہے۔ اُس کی آنکھوں میں کوئی التجا نہ تھی۔ وہ بڑا سفاک لگ رہا تھا۔ آتے ہی وہ گرج کر طالب ہوا۔

''اے ساقی نعیم، تم اور تمہارا یہ مشین آسمانی طاقتوں کے حامل ہیں۔ تم نے سب کی خواہشیں پوری کی ہیں۔ میری اس خواہش کو بھی پوری کرو۔ میں جس ملک کا باشندہ ہوں مجھے اُس ملک کا شہنشاہ بنا دو! سائرس اعظم اور اکبر اعظم کی طرح کا شہنشاہ اور اُس ملک کے تمام باشندوں کو میرا مطیع و فرمانبردار بنا دو، سنتے ہو؟

یہ سن کر پہلے تو ساقی نعیم کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اُس کی آنکھیں سرخ ہونے لگیں۔ وہ جانتا تھا کہ اُس ملک میں چند ایسے باشندے بھی ہیں جنھیں کسی بھی قیمت پر آمریت پسند نہیں ہے۔ پہلی بار ساقی نعیم کے تیور بدلے اور اُس نے کہا۔ ''ایک تم اکیلے کی خاطر میں تمہارے ملک کے تمام باشندوں کے دل بدل نہیں سکتا۔ بہتر ہوگا خود تمہارا دل بدل ڈالوں۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اے ساقی نعیم۔ تم نے تو ابھی تک کسی بھی مانگنے والے کو مایوس نہیں کیا ہے۔ اور ہاں میرا دل تم اس لیے بدل نہیں سکتے کہ اس کا بنانے والا تم سے زیادہ اور بڑی ملکوتی طاقتوں کا مالک ہے۔ میں نے اس دل کو بڑی محنت و جتن سے پروان چڑھایا ہے۔ کئی معرکوں سے گذر کر میں نے اسے

مضبوطی بخشی ہے۔ میں تو حکمران بننے کے لیے پیدا ہوا ہوں...... تم نے یہ مشین کس غرض سے بنای ہے؟''

یہ سن کر ساقی نعیم بے قابو ہو گیا۔ وہ لرزنے لگا۔ ''اے نادان میں نے یہ مشین حکمرانی کے لیے نہیں بنای۔ اس سے تو میں لوگوں کے دلوں کی مرادیں پوری کرتا رہا ہوں۔''

''تو کیوں پوری نہیں کرتے تم میرے دل کی مرادیں؟ خیر...... !تم انھیں پوری کرو یا نہ کرو، میاں میں تو شہنشاہی حاصل کر کے رہوں گا۔ یہ میری قسمت میں پہلے سے لکھ دیا گیا ہے۔ اور اگر تم نے یہ مراد پوری نہیں کی تو تمہاری شہرت اور تمہارے نام پر دھبہ لگ جاے گا۔ اُس کے بعد تمہارا نام لیوا کوی نہ ہوگا۔ تم چاہتے ہو کہ تمہارا نام باقی رہے تو دیر نہ کرو۔''

یہ سن کر ساقی نعیم کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں۔ اُن سے دھنواں اور آگ کے شعلے نکلنے لگے لیکن اب اُسے اپنے مشین کے کھوکھلے پن کا احساس ہو گیا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے نکلتی ہوی آگ اُس کے چہرے پر اور پھر اس کے سارے جسم میں پھیل گئی۔ اُس نے اپنی آواز بلند کی، اس قدر بلند کہ اُس کی آواز کے سوا اور کچھ سنای نہ دیتا تھا۔ پھر اُس نے کہا۔

''تمہارے ملک کے باشندوں کو تمہارا مطیع و فرمانبردار بنانے سے بہتر ہوگا کہ میں اس مشین کے پرزے پرزے کر ڈالوں۔'' یہ کہتے ہوے اُس نے مشین کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اُٹھالیا۔ اُسے اپنے سر سے اُونچا اُٹھایا اور زمین پر اس زور سے پٹکا کہ ساری کائنات میں بگ بیانگ (Big Bang) جیسی آواز آی اور اس آواز کے ساتھ ہی ساقی نعیم کی آنکھ کھل گئی۔

ساقی نعیم نے اپنے چاروں طرف نظر دوڑای۔ ساری چیزیں جہاں کی تہاں موجود تھیں۔ البتہ ایک بے کیفی اُس کے سارے وجود پر چھای ہوی تھی۔ وہ زیادہ دیر تک بستر پر کروٹیں لے نہیں سکتا تھا۔ معمول کے مطابق وہ اُٹھا اور ہاتھ میں بالٹی لیے محلے کے نل کی طرف چل پڑا۔ وہ جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا اُس کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پھیلتی گئی۔ محلے کے لوگوں نے اُسے اس طرح مسکراتے ہوے پہلی بار دیکھا تھا۔ کوی نہ جان سکا کہ وہ کیسی مسکراہٹ تھی۔

✠ ✠ ✠

سیلاب

''ٹلنی تو بڑی ہو کر کیا کرے گی؟''

احباب گھر کے ہوں یا باہر سے آئے ہوئے یہی ایک سوال ٹلنی سے کیا کرتے۔

ٹلنی کے دو ڈھائی سال تتلانے میں گذر گئے۔ جب وہ تین سال کی ہوی تو وہ ایک ہی جواب دُھراتی۔ بڑے اعتماد سے وہ کہا کرتی۔

''میں وشنو بھگوان کی پوجا کروں گی۔''

گھر میں جب بھی کوی مہمان آتا تو ٹلنی چپکے سے اپنی ماں یا بڑی ماں کی گود میں جا بیٹھتی۔

''بولو بیٹی بولو، تم بڑی ہو کر کیا کرو گی؟''

''بڑی ہو کر میں وشنو بھگوان کی پوجا کروں گی۔''

''پھر تو تمھیں سب کچھ مل جائے گا۔'' بڑی ماں کو بھی اُسی ایک جواب کے سننے کی عادت تھی۔ ٹلنی کے باپو کئی بار یہ منظر دیکھ چکے تھے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بیٹی بڑی ہو کر اگر صرف پوجا کرتی رہے گی تو اُسے سب کچھ کیسے مل جائے گا۔ پہلے تو اُسے پڑھای کرنی ہے۔ اُس کے بعد اگر کوی اچھا لڑکا نہ ملے تو پھر اُسے نوکری کرنی ہوگی۔ کئی بار اُن کا جی چاہا، ٹلنی کی ماں سے کہے کہ لوگوں کو اس طرح کا سوال کرنے سے روک دے۔ خود تو وہ یہ کام نہ کر سکتے تھے کیوں کہ وہ اکثر دن دن بھر گھر سے باہر رہتے۔ واپس آتے تو

کارخانے کے لوگ اُن کے ساتھ ہوتے۔ یہ کام تو ماں کو کرنا چاہیے۔ لیکن بھگوان کی پوجا کرنے سے بچوں کو ماں کیسے روک سکتی ہے۔ وہ تو یہی کہے گی کہ وشنو بھگوان سے تو دُنیا میں چین اور امن قائم ہے۔ وہی تو سب کے پالنے والے ہیں۔ اُن کی پوجا سے کوئی کیوں کر روکے۔

نلنی کے باپو کو کئی دن تک کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اُن کے ساتھ سارے مذاہب کے لوگ آتے۔ چند پڑھے لکھے لوگوں کی صحبت میں رہ کر وہ روشن خیال ہو گئے تھے۔ کس کے گھر میں کیا ہوتا ہے وہ تو نہیں جانتے تھے لیکن اس کا اُنھیں پورا یقین تھا کہ آدمی کچھ نہ کرے تو بھگوان اُسے کچھ دینے والا نہیں۔ ویسے نلنی اچھا پڑھتی بھی تھی اور کلاس میں اول بھی آتی تھی۔ نلنی کے باپو نے سوچا اچھا ہی ہے بچوں میں پوجا پاٹ کی عادت تو مشکل ہی سے آتی ہے۔ کیا پتا اِسی سبب نلنی کو کوئی اچھا لڑکا پسند کرے۔

نلنی نے سولہ سال کی عمر میں میٹرک پاس کر لیا۔ دو سال یوں ہی گذر گئے۔ اپنی پوجا میں اُس نے زیادہ وقت لگانا شروع کر دیا۔ وہ اٹھارہ سال کی ہو گئی۔ کوئی نوکری بھی نہیں ملی۔ اس بیچ کئی پیامات آئے لیکن کسی نہ کسی وجہ سے بات نہ بنی۔ اب جو جسونت کے ماں باپ نے نلنی کے گھر قدم رکھا تو اُنھیں کسی اور بات کا لالچ نہ تھا۔ یہی ایک بات جسونت کی ماں کو بہت پسند آگئی کہ نلنی ایک بھگت جیسی ہے اور وہ بھی وشنو بھگوان کی بھگت۔ انسان کو اور کیا چاہیے۔ اُسے ایک بھگوان کا مل جانا کافی ہے۔ یہ دُنیا تو جوں توں کر کے گذار لی جائے گی۔ اصل تو بھگوان کے چرن ہیں۔ وہ مل گئے تو سب کچھ مل گیا۔ نلنی صورت شکل سے بھی بری نہ تھی۔

جسونت کی سرکاری نوکری تھی۔ فشریز کے محکمہ میں وہ سپروائزر تھا۔ آئے دن تبادلہ بھی ہوتا تھا۔ اُسے ایک ایسی سگھڑ بیوی کی ضرورت تھی جو گھر کی دیکھ بھال کر سکے۔ اِدھر شادی ہوئی اُدھر جسونت کا تبادلہ ناگری گاؤں ہوا جو ایک ساحلی علاقہ تھا۔ جسونت اپنے ماں باپ اور نئی دلہن کے ساتھ ناگری منتقل ہوا۔ نلنی وشنو بھگوان کی مورتی کو میکے ہی سے اپنے ساتھ لائی تھی۔ یہاں آ کر اُس نے گھر میں ایک کمرہ اس مورتی کے لیے مخصوص کر دیا اور ہر روز صبح و شام ایک ایک گھنٹہ کا وقت نکال کر وہ اس مورتی کی پوجا کرتی۔ نلنی کی ساس چند برس تک بہو بیٹے کے ساتھ ناگری میں رہی۔ جب نلنی کے دو بچے ہوئے اور وہ بڑے ہو کر اسکول جانے لگے تو ساس اپنے میاں کے پاس واپس آگئی۔

بھگوان کی پوجا کے وقت نلنی اپنے بچوں دیپک اور پریا کو بھی ساتھ کر لیتی۔ جسونت گھر پر ہوتا تو کبھی کبھی وہ بھی پوجا میں شامل ہو جاتا لیکن جسونت صرف وشنو بھگوان کا بھگت نہیں تھا۔ وہ اپنے سُسر پر گیا

تھا۔ اس کے گھر آنے والوں میں ہر مذہب کے لوگ ہوتے۔ سرکاری نوکری کے علاوہ وہ ایک سوشیل ورکر بھی تھا اور اُس نے اپنے گھر میں دوسرے مذاہب کی تصویریں بھی لگا رکھی تھیں۔ ایک طغرا اللہ کے نام کا تھا۔ ایک تصویر حضرت عیسیٰ کی تھی۔ ایک گوتم بدھ کی اور ایک کرشن مراری کی جس میں وہ گاو ماتا سے لگے کھڑے بانسری بجا رہے تھے۔

ناگری گاوں سمندر سے لگا ہونے کی وجہ یہاں ہر سال کوی نہ کوی چھوٹا بڑا سیلاب آجاتا۔ سمندر سے لگی مچھیروں کی جھونپڑیاں بہہ بھی جاتیں اور جب جب بڑا سیلاب آتا تو گاوں کے اکثر لوگ مکانات خالی کردیتے۔ ایک سال سمندر میں جب بڑا طوفان آیا تو نلنی کو خوف ہونے لگا وہ کبھی کبھی بچوں کو ساتھ لیے سمندر پر جاتی۔ سب مل کر وشنو بھگوان کی پوجا کے پھول سمندر میں بہادیتے۔ پھر نلنی ہاتھ اُٹھا کر بھگوان سے پرارتھنا کرتی کہ اُس کا پریوار سلامت رہے۔ چند سال تک تو سمندر میں چھوٹے چھوٹے طوفان آتے رہے۔ ساحلی علاقوں میں دور دور تک کھیت اور باغات تباہ بھی ہوے۔ کچھ کمزور جھونپڑیاں اور مٹی کی بنیاد والے مکانات ڈھ بھی گئے لیکن ناگری گاوں کی زندگی میں کوی بڑا فرق نہ آیا۔ پچھلے سال طوفان ذرا بڑا آیا تو کہیں کہیں مکانات کا سامان اور چند مویشی بھی سیلاب کی نظر ہوے۔ لیکن اس سال جو سیلاب آیا تو دور دور تک آبادیوں کی آبادیاں ویران ہوگئیں۔ رات سونے سے پہلے جسونت نے کہا :

''نلنی اس دفعہ بڑے بھیانک سیلاب کی خبر ہے کئی ساحلی گاوں خالی کردیے گئے ہیں۔ اگر صبح تک طوفان نہ اُترے تو ہمارے گاوں کو بھی خطرہ ہے۔''

''ایسا تھا تو ہم لوگوں کو گاوں خالی کردینا چاہیے تھا۔'' نلنی نے جواب دیا۔

''اس طرح وقت سے پہلے گھر خالی کرتے رہیں تو ہر سال یہی کرنا پڑے گا۔ چلو، اب سوجاو۔ صبح دیکھیں گے۔'' جسونت نے نلنی کو دلاسا دیا لیکن نلنی کی بے چینی دور نہ ہوی۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے پھر کہا

''ذرا پڑوس اور گاوں والوں کی تو خبر لو۔ دیکھو کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔''

اس پر جسونت نے کہا :

''میں ابھی تو باہر سے آرہا ہوں۔ پردیپ اور بالا رسور گاوں کے لوگ اپنے اپنے مکانات خالی کرچکے تھے۔ لیکن اب وہ واپس ہورہے ہیں اس لیے کہ طوفان تھم رہا ہے۔ اب سو بھی جاو۔ ہم اپنے گاوں والوں کے ساتھ ہیں۔ جیسا وہ کریں گے ویسا ہی ہم بھی کریں گے۔''

صبح نلنی اور جسونت ابھی بیدار نہ ہونے پاے تھے کہ اُنھوں نے دور نزدیک کی مختلف آوازیں

سنیں جیسے لوگ گھر کا سامان اُٹھا رہے ہوں اور بھاگ دوڑ کر رہے ہوں۔ جسونت نے دوڑ کر باہر دیکھا تو سڑکوں اور گلیوں میں پانی بہہ رہا تھا۔ لوگ گھر بار چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں صندوق تھا۔ کوی اپنے بچوں کو سیکل پر بٹھائے لے جا رہا تھا۔ کچھ لوگ اپنے جانوروں کو ہانک کر لے جا رہے تھے۔ اب جسونت کے پاس وقت بالکل کم تھا۔ چند لمحوں میں وہ واپس گھر میں داخل ہوا اور بچوں کو جگا کر جس حالت میں وہ تھے اُسی حالت میں اُنھیں نلنی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''نلنی، اب گھر کو تالا ڈالنے کا بھی وقت نہیں ہے چلو بھاگ نکلو۔ سارا گاوں خالی ہو گیا ہے۔ طوفان پلٹ کر ساحل کی طرف آ رہا ہے۔''

یہ سن کر نلنی حیران و پریشان اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ بوکھلاہٹ میں اُسے کچھ بجھای نہ دیا۔ وہ فوراً اپنے پوجا کے کمرے کی طرف دوڑی۔ اُس نے وشنو بھگوان کی مورتی کو اُٹھا کر اپنی ساڑی میں لپیٹ لیا۔ مورتی ذرا وزنی تھی اور ساڑی میں سنبھل نہیں رہی تھی۔

''تم دیپک کو پکڑے رہو، میں پریا کو سنبھالتی ہوں اور ہاں ساتھ میں کرشنا بھگوان کی فوٹو بھی لے لو۔ وشنو ماتا کو تو میں سنبھال رہی ہوں اب وہی ہماری رکشا کریں گے۔'' اس پر جسونت نے کہا:

''نلنی کوی بھگوان اس طرح کسی کی رکشا نہیں کرتے۔ اب باتوں کا وقت نہیں رہا۔ کسی بھی چیز کے پیچھے نہ پڑو۔'' یہ کہہ کر جسونت نے پریا کو نلنی کے ہاتھوں سے لے لیا اور اپنے کاندھوں پر اُٹھا لیا دونوں ماں باپ دیپک اور نلنی کے ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر آ گئے۔ اب پانی گھٹنوں تک چڑھ گیا تھا۔ آبادی سے باہر نکلتے ہوے نلنی اور جسونت نے دیکھا کہ پیچھے آنے والوں میں صرف دو چار لوگ ہی رہ گئے ہیں۔ گاوں کے سارے لوگ پہلے ہی جا چکے تھے۔ ایک دو بوڑھے ان لوگوں سے آگے چل رہے تھے۔ دُور کوی دُبلا پتلا شخص ایک درخت کے پیڑ سے چپکا ہوا تھا، اس میں چلنے کی سکت نہ تھی۔ ذرا آگے بڑھے تو پانی کا بہاؤ تیز ہوتا نظر آیا۔ اب پانی دیپک کی کمر سے اُونچا ہو چکا تھا اور نلنی کے پاوں بڑی مشکل سے زمین کو چھو رہے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے ہلکی ہلکی بارش تھی تو کہیں کوی چھتری پکڑے ہوے اپنے بچوں کو لے کر آگے بڑھ رہا تھا۔ اب بارش تھم گئی تو ہوا کے تیز جھکڑ چلنے لگے۔ نلنی ایک قدم آگے بڑھتی تو اُسے دیڑھ قدم پیچھے ہونا پڑتا۔ جسونت کا ہاتھ تھامے نلنی اور اس سے لگا دیپک ایک ایک انچ آگے بڑھ رہے تھے۔ آبادی کے مکانات بہت دور پیچھے رہ گئے۔ سامنے کہیں کہیں درختوں کے پیڑ نظر آ رہے تھے۔ پانی کا جب بھی کوی ریلا آتا تو اُس پر کہیں کھانے کے برتن اور کہیں بکھرے ہوے کپڑے بہتے اور غوطہ کھاتے دکھای

دیتے۔ دور ایک گائے تیرتی ہوئی سر اُٹھائے بھاں بھاں کر رہی تھی۔ اُس کے گلے میں بندھی ٹوٹی رسی پانی کے اُوپر نیچے ہو رہی تھی۔

''نلنی وقت کم رہ گیا ہے۔ ہمت کرو اور جلدی کرو۔ تیز، بہت تیز۔'' یہ کہتے ہوئے جسونت نے مڑ کر دیکھا تو پانی دیپک کے سینے تک آ چکا تھا۔ اُس نے لپک کر دیپک کو اُٹھالیا اور پھر نلنی سے کہا۔ ''اب پریا کو تم اپنے کاندھوں پر اُٹھالو۔ سنبھل سنبھل کر قدم آگے بڑھانا اور سنو اس مورتی کا وزن تمہارے لیے زیادہ ہے اِسے مجھے دے دو۔'' جسونت نے جیسے ہی یہ کہا نلنی نے مورتی کو اپنے جسم سے اور بھی قریب کر لیا اور اُسے اپنے سینے سے چمٹالیا۔

اپنے اپنے کاندھوں پر دیپک اور پریا کو اُٹھائے دونوں میاں بیوی مشکل سے قدم آگے بڑھانے لگے۔ وہ دو چار قدم ہی آگے بڑھے ہوں گے کہ سیلاب کا ایک اور تیز بہاو آیا۔ نلنی کی چیخ نکل گئی اُس نے دیکھا کہ اس ریلے میں کسی بوڑھی عورت کا سر نظر آ رہا ہے کچھ سیاہ اور کچھ سفید اُلجھے ہوئے بال پانی میں اُوپر نیچے ہو رہے ہیں۔ نلنی کے قدم ڈگمگائے اور ہاتھ کانپنے لگے سیلاب کا ریلا اور تیز ہوا اب نلنی کے ہاتھ تھرتھرائے اُس نے پریا کو اپنی بانہوں میں بھینچنا شروع کیا اور جب اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پریا کو سنبھالا دیا تو بھگوان کی مورتی خود بہ خود اس کی ساڑی اور ہاتھوں سے پھسل کر پانی میں گر گئی۔

جسونت نے جھپٹ کر نلنی اور پریا کو سہارا دیا وہ اپنے دوسرے ہاتھ سے دیپک کو اپنے کاندھے پر سنبھالے ہوئے تھا دونوں بچے بلبلا کر رو رہے تھے۔

''رُک جاؤ نلنی، رُک جاؤ۔'' جسونت چلایا۔ وہ جانتا تھا کہ پانی کے تیز ریلے میں ایک قدم بھی آگے اُٹھانا زندگی سے ہاتھ دھونے کے برابر ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو مضبوطی سے تھامے اور بچوں کو اپنے اپنے کاندھوں پر لیے تھوڑی دیر تک یوں ہی ٹھہرے رہے۔ سیلاب کا ایک اور چھوٹا ریلا آیا لیکن وہ پہلے سے بہت کمزور تھا۔ اس کے بعد پانی کا بہاو آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا۔ جب پانی چار چھ انچ اُونچای پر رہ گیا تو جسونت نے نلنی کے کاندھے کو اپنے ہاتھ سے دبایا اور اُسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

نلنی نے سوچا مورتی تو مٹی کی نہیں تھی مٹی کی ہوتی تو وہ پانی میں گھل جاتی وہ تو پنچ دھاتوں کی بنی تھی۔ کہیں آس پاس ہی پڑی ہوگی لیکن اب وہ اُسے کہاں ڈھونڈے۔ نلنی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے کہ وشنو بھگوان نے خود ڈوب کر اُس کے پریوار کو بچالیا۔

✠✠✠

نکشترا

انور جمال بینک سے پیسے نکال کر کار کی طرف بڑھ رہے تھے کہ انھیں پیچھے سے ''انکل'' کی آواز سنائی دی۔ ان کے قدم رُک گئے۔ آہستہ سے پلٹ کر دیکھا تو دو جوان لڑکیاں ان کی طرف آ رہی تھیں۔ ایک نے مزید آگے بڑھتے ہوئے کہا :

''ساری انکل، ہم لوگ آپ کو تکلیف دے رہے ہیں۔ آپ برا تو نہ مانیں گے؟''

''کیا بات ہے؟'' انور نے اجنبیت کو دور کرنے کے لہجے میں دریافت کیا۔

''انکل ہمارا ایک ضروری کام ہے۔ ہم دونوں کا کھاتا اس بینک میں کھلوا دیجیے۔''

کسی اجنبی لڑکی کے اچانک مخاطب ہونے پر وہ غور کر ہی رہے تھے کہ لڑکی نے التجا بھری آواز میں اپنی بات پوری کی۔ ''آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ بینک والے کہتے ہیں کہ کوئی جان پہچان چاہیے۔''

''لیکن میں تو آپ لوگوں کو نہیں جانتا۔''

''یہاں ہم لوگوں کو کوئی جاننے والا ہوتا تو ہم آپ کو اس طرح تکلیف نہ دیتے۔''

دونوں لڑکیاں سلیقے کی دکھائی دے رہی تھیں۔ لباس معمولی سے لیکن صاف ستھرے تھے۔ انور نے سوچا لڑکیاں بھولی بھالی اور ضرورت مند لگتی ہیں۔ کیا حرج ہے اگر بینک منیجر سے ان کا تعارف کروا دیا جائے۔ اُنھوں نے پوچھا۔

''کتنے روپوں کا اکاونٹ؟''

''زیادہ نہیں۔بس یہی سو دو سو کا۔انکل ہم لوگ پارٹ ٹائم کام کرتے ہیں، بہت کم کماتے ہیں۔ اگر کھاتہ کھل جائے گا تو ہم لوگ کبھی کبھی سو پچاس روپے اس میں جمع کروا دیں گے۔کیا پتہ کس وقت ضرورت پڑ جائے۔''

انور کو یاد آیا کہ اس بینک میں چک بک کے بغیر چھوٹے اکاونٹ کھولے جا سکتے ہیں۔دونوں لڑکیوں کو لے کر وہ بینک منیجر کے پاس گئے۔اس بینک کے وہ بہت پرانے کسٹمر تھے اور بہت سے لوگ انھیں جانتے تھے۔جوں ہی انھوں نے خواہش کی بینک منیجر نے اٹنڈر کو آواز دے کر اکاونٹ کھولنے کے دو فارم منگوا دیے۔خانہ پری کی نوبت آئی تو منیجر نے انور سے پوچھا۔''آپ ان لوگوں کو کیسے جانتے ہیں؟''

''انور نے کچھ سوچتے ہوے کہا یہ دونوں میرے پڑوس میں رہتی ہیں، اکثر انھیں بس اسٹانڈ پر کھڑا دیکھتا ہوں۔''

''خیر......! آپ کو بھروسہ ہے تو ہمیں کوی اعتراض نہیں۔''

لڑکیوں نے فارم کی خانہ پری شروع کر دی اور پوچھنے لگے کہ کہاں کیا لکھا جاے۔پتہ کا کالم آیا تو لڑکیوں نے انور سے کہا۔

''انکل ہم لوگوں کو مکان کا نمبر یاد نہیں رہا۔ہم لوگ کرایہ کے مکان میں رہتے ہیں۔اگر آپ اجازت دیں تو آپ کے گھر کا پتہ یہاں لکھ دیں گے۔''

انور ذرا جھجکے تو بینک منیجر نے بھانپتے ہوے کہا کوی بات نہیں، فارم بعد میں بھر لیں گے۔آپ لوگوں کے دو، دو فوٹوز چاہیے۔آپ فارم لے کر فوٹوز کے ساتھ کل یا پرسوں آجاییے۔

اس کے بعد انور وہاں سے اُٹھے اور ان دونوں لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے کر اپنی کار کی طرف چل پڑے۔کار کے پٹ کھول کر وہ کار میں بیٹھ گئے اور لڑکیوں سے کہا کہ وہ بھی کار میں بیٹھ جایں۔کار جب بینک کے احاطہ سے باہر نکلی تو دونوں لڑکیوں نے ایک ساتھ کہا۔

''ہم کو معاف کر دیجیے انکل۔''

''اتنا تو معلوم ہوا ہے کہ تم میں سے ایک انجنا دیوی ہے اور دوسری سنیتا دیوی۔یہی نام تو فارم میں لکھے ہیں نا آپ دونوں نے؟''

''ہاں انکل یہ نام تو ہمارے ماں باپ نے دیے ہیں۔''

''بہت پیارے نام ہیں ۔لیکن یہ بتاؤ کہ تم لوگوں نے ایسا کیوں کیا؟ بینک منیجر میرے بارے میں کیا سوچ رہا ہوگا۔''

''آپ کو تکلیف ہوی انکل ۔ہم بے حد معافی چاہتے ہیں ۔آپ بہت اچھے آدمی ہیں ۔''

''میں اچھا ہوں یا برا اس کی مجھے چنتا نہیں ہے ۔ یہ بتاؤ کہ اب میں تم لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کروں؟اب تمھیں میں کہاں اُتار دوں ۔کسی بس اسٹانڈ کے قریب؟''

''وہاں اُتر کر ہم کیا کریں گے؟ اس وقت تو ہم لوگوں کو کہیں جانا نہیں ہے ۔ انکل اس وقت ہم لوگوں کو بہت بھوک لگی ہے ۔''

''بھوک لگی ہے کے الفاظ نے انور کے ذہن کے دریچے کھول دیے ۔گویا یہ لڑکیاں اپنی روزی روٹی کی تلاش میں نکلی ہیں ۔ بینک اکاونٹ تو ایک بہانہ ہے ۔انور کو یاد آیا۔صبح دستر خوان پر عمدہ ناشتہ رکھا تھا۔انھوں نے اپنی عمر اور وزن کا خیال کرتے ہوے بہت ہی کم کھایا تھا۔لیکن ماضی میں انھیں جو کچھ بھگتنا پڑا تھا وہ اسے بھولے نہیں تھے ۔ایک دفعہ دو دن کے بعد انھیں پیٹ بھر کر کھانے کو ملا تو اس وقت کے ذائقہ اور اس کیفیت کو وہ بھول نہیں پاے تھے ۔اب انھوں نے لڑکیوں سے کرید کرید کر سوال کرنا شروع کر دیا تو انھیں معلوم ہوا کہ یہ دونوں قریب کے اضلاع سے آی ہوی لڑکیاں ہیں ۔انجنا کی ایک آنٹی شہر کے ایک خانگی ہسپتال میں ملازم ہے ۔اسی کے کمرہ میں انجنا عارضی طور پر ٹھہری ہے ۔ چند دن قبل سنیتا کی اتفاقاً اس سے ملاقات ہوگئی ۔دونوں کا پیشہ ایک تھا۔دوستی میں دیر نہ لگی ۔

تمھاری آنٹی اس بات سے واقف ہے؟ اسے تمھارے کام پر اعتراض نہیں؟ انور نے ایک آخری سوال کیا تو انجنا نے جواب دیا۔

''انکل میں آپ کو یہ بتا دوں کہ ہم دونوں کے نام صرف انجنا اور سنیتا ہیں ۔ دیوی کا اضافہ تو ہم لوگوں نے اپنے گاہکوں کو خوش گمان کرنے کے لیے کیا ہے ۔میری آنٹی کا نام کملا بای ہے ۔ دواخانہ میں کام کرنے سے پہلے وہ بھی یہی پیشہ کرتی تھی ۔اسے اُمید ہے کہ ہماری آمدنی بڑھ جاے گی تو اسے بھی کچھ حصہ ملے گا۔ پولیس کا الگ سے ڈر لگا رہتا ہے ۔ہم لوگوں کو بڑی احتیاط کرنی پڑتی ہے ۔آسانی سے کوی بھلا آدمی نہیں ملتا۔''

''اب میں تم لوگوں سے کوی دوسرا سوال نہیں کروں گا...... چلو...... پہلے تم لوگوں کو کہیں اچھا کھانا کھلوا دوں ۔''

یہ کہتے ہوئے انور نے اپنی کار کا رُخ ایک ایسی ہوٹل کی طرف کرلیا جہاں انھیں اچھا کھانا مل سکتا تھا اور بھیڑ بھاڑ بھی نہیں ہوتی تھی۔ ہوٹل میں داخل ہونے لگے تو دیکھا کہ چاروں طرف میزوں پر گل دان رکھے ہوئے ہیں۔ ایک کشادہ میز کو دیکھ کر انور وہاں بیٹھ گئے اور انجنا اور سنیتا کو اپنے سامنے بٹھالیا۔ پھولوں کے گل دانوں کو چھوتے ہوئے انور گذشتہ شب کی یادوں میں کھوگئے۔

انور کے قدیم دوست ویرابھدرراجو کی بیٹی کی شادی تھی۔ راجو اکسائز محکمہ کے سکریٹری تھے۔ لڑکی نے ایم-اے پاس کیا تھا اور اب کمپیوٹر کا کورس کر رہی تھی۔ لڑکا امریکہ سے آیا ہوا تھا۔ جگمگ کرتا ہوا شادی خانہ مہمانوں کی آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ شادی خانہ پہلے کسی جاگیردار کا محل تھا۔ گیٹ پر چوکیدار اور پولیس کے جوان متعین تھے۔ کاروں کی قطاریں لگی تھیں۔ بڑی مشکل سے انور نے اپنی کار کے لیے جگہ بنائی۔ ہرے بھرے لان سے گذر کر آگے بڑھے تو ایک طویل ورانڈا نظر آیا جہاں تیز قمقموں کی روشنی میں دن کے اُجالے کا گمان ہوتا تھا۔ ذرا فاصلے سے ایک اور ورانڈا تھا یہاں مہمانوں کی آمد کے ساتھ ہی ان کی ضیافت کا انتظام تھا۔ پہلے ورانڈے کے اختتام پر اسٹیج سجایا گیا تھا۔ شہنائی کی آواز کے ساتھ پجاری کی آواز بھی گونج رہی تھی۔ کبھی شہنائی کی آواز اُونچی ہوتی کبھی پجاری کی آواز۔ انور نے اسٹیج کے قریب بیٹھ کر شادی کے رسومات کا جائزہ لیا تھا۔

دولہا کے سامنے دو عورتیں پردہ پکڑے کھڑی تھیں۔ دوسری طرف سے دو جوان لڑکیاں دلہن کو تھامے پردے کے قریب لے آئیں اور اسے پردے کی دوسری جانب بٹھادیا۔ انور نے گل دانوں کو میز کی ایک جانب کر دیا تو انجنا کا چہرہ ان کے سامنے تھا۔ وہ انجنا کے چہرے کا موازنہ دلہن کے چہرے سے کرنے لگے۔ رنگ روپ ویسا ہی تھا۔ ناک نقشے میں بھی کوئی زیادہ فرق نہیں تھا اور اس وقت تو انجنا کی کھلی باہیں اور برہنہ گلا انور کو زیادہ ہی دل کش لگ رہے تھے۔ اتنے میں بیرا قریب آگیا اور اس نے مینو کارڈ آگے بڑھادیا۔ انجنا نے مینو کارڈ ہاتھ میں لے کر اِدھر اُدھر سے دیکھنا شروع کیا۔ کارڈ کا بیچ میں آنا تھا کہ انور کو یاد آیا دولہا نے پردے کے اُوپر سے گندھے ہوئے آٹے جیسی کوئی چیز دلہن کے سر پر رکھ دی۔ دلہن نے بھی ایسا ہی کیا۔ بعد میں انور کو معلوم ہوا کہ وہ زیرہ اور گڑ کا بنا ہوا مادہ تھا۔ اس کا مقصد ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ انجنا نے مینو کارڈ کو انور کی طرف بڑھادیا اور میز کے نیچے سے اپنے پیر کو آگے بڑھاتے ہوئے انور کے پیر سے ٹکرایا۔ انور کے جسم میں ایک ہلکی سی جھرجھری ہوئی جو زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ انھیں یاد آیا۔ دولہا دلہن کے درمیان سے پردہ نکال دیا گیا ہے۔ دونوں سروقد کھڑے ہیں۔ دولہے نے اپنا دایاں

پاؤں آگے بڑھا دیا ہے۔دلہن نے اپنا پاؤں اس پر رکھا ہے۔ پھر دولہا نے اپنا پاؤں ہٹا لیا ہے۔اب دلہن کی باری ہے۔ دلہن نے اپنا دایاں پاؤں آگے بڑھا دیا تو دولہا نے اپنا پاؤں اس پر رکھا ہے۔ یہ عمل پانچ سات بار دہرایا گیا۔ پھر دلہن کے پاؤں کی اُنگلیوں میں انگوٹھیاں پہنائی گئیں۔اس کے بعد کسی نے سونے اور موتیوں سے چمکتا ہوا ہار دولہا کے ہاتھ میں تھما دیا تو اس نے اسے دلہن کے گلے میں پہنا دیا۔انور کی نظریں مینو کارڈ سے اُوپر اُٹھیں تو اس نے انجنا کے گلے کو پہلے ہی کی طرح کھلا پایا۔اس نے اپنی گردن کو ایک ہلکا سا جھٹکا دیا۔مینو کارڈ کو دوبارہ دیکھا۔غور سے پڑھنے کی کوشش کی تو فہرست میں لذیذ کھانوں کے ساتھ سادے چاول کی ایک ڈش بھی تھی۔ چاول پر جوں ہی نظر پڑی اسے یاد آیا دولہا دلہن مٹھیوں میں بھر بھر کر ایک دوسرے کے سروں پر چاول ڈال رہے ہیں۔ہلدی کے پاؤڈر کے ملاوٹ کی وجہ چاول کا رنگ زرد زرد ہے جو کپڑوں پر بھی پھیلتا جا رہا ہے۔ بہت دیر تک یہ عمل جاری رہا۔دونوں تھک گئے تو ان کے رشتہ داروں نے انھیں اُکسا کر پھر سے ان کی مٹھیاں چاول سے بھر دی ہیں۔جب چاولوں کے ساتھ دولہا دلہن کے سروں پر سے ایک ایک موتی پھسل کر نیچے آ رہا تو یہ کھیل ختم کر دیا گیا اور اب پیتل کا ایک گھڑا دونوں کے درمیان رکھ دیا گیا۔انور کی خیالی دُنیا کو پھر سے ایک جھٹکا لگا جب اس نے انجنا کی آواز سنی۔

''انکل اب بھوک کچھ زیادہ ہی لگی ہے۔''

انور نے فوراً ہی چند کھانوں کا آرڈر دیا اور پھر سے وہ شادی کے منظر میں گم ہو گئے۔ پیتل کے گھڑے میں چاول تھے اور اس میں ایک انگوٹھی ڈال دی گئی تھی۔شرط تھی کہ دولہا دلہن گھڑے میں ہاتھ ڈال کر انگوٹھی کو نکالیں۔جس کے ہاتھ انگوٹھی پہلے لگے گی وہ جیت جائے گا۔سامنے میز پر انجنا نے اپنی کہنیاں ٹکا دی تھیں اور ان سے وہ اپنی ٹھوڑی کو تھامے ہوئے تھی۔انور کے کیا جی میں آئی کہ انھوں نے بے اختیار انجنا کی دونوں کلائیاں پکڑ لیں اور اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہنے لگے۔

''تمہاری کسی بھی انگلی میں کوئی انگوٹھی نہیں ہے۔''

اتنے میں بیرا کھانا لے کر آ گیا۔اسے آتا ہوا دیکھ کر انور نے انجنا کے ہاتھ چھوڑ دیے۔انھوں نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے بیرا کے ہاتھ سے ایک ڈش لے لی اور سنیتا کے سامنے رکھ دی۔ جب ساری ڈشیں میز پر چن دی گئیں تو انھیں پھر یاد آیا کہ رات شادی میں کتنے ہمہ اقسام کے کھانے تھے۔ایک ایک میز پر کوئی پچیس تیس ڈشیں تھیں۔ ویجیٹیرین اور نان ویجیٹیرین کے الگ الگ میز تھے۔ میٹھوں کی اور آئسکریم کی میزیں ذرا پرے تھیں۔کولڈ رنک اور ہاٹ ڈرنک کا انتظام الگ سے۔ پان سپاری کی ایک

الگ میز۔ ہر میز پر چار تا چھے خادم تھے اور دوڑ دوڑ کر مہمانوں کی ضیافت کرتے جارہے تھے۔ انور کی یادوں میں رات کا وہ منظر تھا اور ساتھ ہی وہ انجنا اور سینتا کو کھاتے ہوئے دیکھ کر خوش بھی ہورہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں دونوں لڑکیوں کے کھانے کی رفتار سست ہونے لگی۔ کھانا ختم ہوا تو پانی کا گلاس ہاتھ میں لیتے ہوئے انجنا نے انور کی طرف دیکھا۔ وہ پانی پینے لگی تو انور کو پھر ایک بار دلہن یاد آگئی۔ ابھی ایک اور رسم باقی تھی۔ دولہا اور دلہن کو لان میں لایا گیا تھا۔ پجاری ان کے ساتھ تھا۔ رشتہ دار تھوڑے سے فاصلے پر کھڑے تھے وہ سب کے سب آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''دیکھو...... اس طرف ...... ادھر ہاں ادھر، میری اُنگلی کی سیدھ میں'' پجاری کہہ رہا تھا۔ ''نظر آگیا...... ''اس ستارے کو اروندتی نکشترا کہتے ہیں۔'' پجاری رُک رُک کر جملے ادا کررہا تھا۔ دولہا دلہن آسمان کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھے جارہے تھے۔ اروندتی نکشترا پہلے دلہن کو نظر آیا پھر دولہا نے تصدیق کی۔ پجاری نے دلہن سے کہا'' تم اپنے سسرال میں راج کروگی۔ وہاں تمہاری حیثیت رانی جیسی ہوگی۔ دلہن کے رشتے داروں نے چند روپے پجاری کے ہاتھ میں تھمادیے۔ اس کے بعد سب منڈپ میں لوٹ آئے۔ اب تحائف کا سلسلہ شروع ہوا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

''انکل ہم نے پیٹ بھر کر کھالیا۔ کھانے بڑے مزے کے تھے۔ البتہ نمک مرچ کی کمی تھی۔ ہم گاؤں کے لوگ نمک مرچ زیادہ کھاتے ہیں۔

انور جیسے خواب سے چونکے اور حقیقی دُنیا میں لوٹ آئے۔

نمک مرچ کے بغیر کھانے کا مزہ ہی کیا ہے۔ کسی کے لیے کم اور کسی کے لیے زیادہ۔ پھر انھیں کیا سوجھی کہ پوچھ بیٹھے۔

یہ تو بتاؤ تم لوگ کبھی خواب دیکھتے ہو؟ انور کے اس اچانک سوال پر انجنا اور سینتا ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ چند لمحوں کی خاموشی رہی۔ پھر انجنا نے کہا۔

''زیادہ تو نہیں انکل ......اور خواب یاد بھی نہیں رہتے۔ ہاں ایک خواب یاد آیا میں نے دیکھا تھا انکل ...... میں کسی گھنے جنگل میں تنہا جارہی ہوں۔ گھپ اندھیرا ہے جب اُجالا ہوا تو سامنے گڑھے ہی گڑھے تھے۔ اچانک ایک بیل ان چٹانوں میں سے نکل کر میری طرف دوڑتا ہوا آیا۔ اس کے بڑے بڑے سینگ تھے۔ اس نے اپنی سینگیں میرے پیٹ میں دھنسا دیں تو سینگ غائب تھے۔ اس کے سر کے دباؤ سے میرا پیٹ دھنسا جارہا تھا۔ پھر میں جاگ گئی۔ اُٹھی تو مجھے بھوک بہت لگ رہی تھی۔ اس کے بعد

مجھے صبح تک نیند نہیں آئی ۔ تیز سینگوں والا بیل میری آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔ اگر اس کے سینگ میرے پیٹ میں دھنس جاتے تو کیا ہوتا؟''

''ایسا تو ایک خواب میں نے بھی دیکھا تھا۔اب سنیتا کہنے لگی میرے سامنے ایک ہاتھی تھا۔ جنگل بالکل نہیں تھا۔ پانی ہی پانی تھا۔ ہاتھی نے اپنی سونڈ سے میری کمر کو پکڑ لیا۔ پھر وہ مجھے اپنے دونوں پاؤں پر اُٹھالیا۔ پاؤں آسمان کی طرف تھے اور میں اس کے پاؤں پر لیٹی تھی ۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہاتھی اپنے پاؤں آسمان کی طرف کیسے کرسکتا ہے۔ میں اس کے پاؤں میں سنبھل نہیں رہی تھی تب اس نے مجھے پانی میں پٹک دیا۔ میں ایک چیخ کے ساتھ اُٹھ بیٹھی ۔ابھی رات باقی تھی ۔ بڑی دیر کے بعد پھر سے نیند لگی۔''

میں بتاتا ہوں کیا ہوا تھا۔ دونوں کے خواب سن کر انور نے توجیہ پیش کی۔''سنیتا اس رات تم نے کھانا زیادہ کھالیا ہوا اور انجنا تم......تم شاید بھوکی سوئی تھیں۔''

یہ کہہ کر ہوٹل کا بل ادا کرتے ہوئے انور وہاں سے اُٹھے تو دونوں لڑکیوں نے بھی ان کی پیروی کی ۔ باہر نکل کر پھر ایک بار تینوں کار میں بیٹھ گئے تو انجنا نے جو سامنے انور کے بازو بیٹھی تھی انور کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور اسے چومنے لگی۔

انور پر انجنا کے اس حرکت سے کوئی کیفیت طاری نہ ہوئی۔ وہ انجنا کی طرف دیکھنے لگے۔

''انکل اب تو نیند آرہی ہے۔ دو تین راتوں سے ہم لوگ برابر سوئے نہیں ہیں ۔لیکن آپ کی کار بڑی بانکی ہے اس میں ذرا دور تک سفر کرنے کو جی چاہتا ہے۔''

''کہاں چلوگی؟''

انور نے آمادگی ظاہر کی۔

''آپ جہاں چاہے لے چلیں ۔کیا یہ ممکن ہے کہ ہم لوگ کچھ دور شہر سے باہر سیر کر آئیں۔''

''ضرور'' کہتے ہوئے انور نے کار اسٹارٹ کی اور آگے بڑھے۔ دور دور تک آبادی کا سلسلہ تھا۔ ٹریفک بھی پیچھا نہیں چھوڑتی تھی ۔ کسی جگہ آبادی نہ پاکر درختوں کی آڑ میں انور اگر اپنی کار روک بھی لیتے تو منٹ دو منٹ سے کوئی نہ کوئی اسکوٹر یا ٹرک بازو سے گذر رہا ہوتا۔

سہ پہر ہونے کو آئی اور انور نے گھڑی دیکھی تو کوئی ڈھائی بج رہے تھے۔انھیں یاد آیا کہ گھر کے لوگوں نے دو بجے تک کھانے پر ان کا انتظار کیا ہوگا۔ تاہم دیر سے سہی اب انھیں گھر لوٹنا چاہیے۔ اس خیال کے آتے ہی انھوں نے کار کا رُخ بدلا۔

انجنا نے کہا،'' کیوں انکل ہم لوگ واپس ہو رہے ہیں؟''

انور کے پاس کوی اور جواب نہ تھا۔ انھوں نے کہا،'' سوری انجنا۔ اس وقت میرے لیے گھر جانا ضروری ہے۔ ہم لوگ پھر کبھی ملیں گے۔

''اپنا پتہ یا ٹیلی فون نمبر تو دیجیے۔''

''نہیں گھر پر تو کوی نہ کوی ٹیلی فون اُٹھالے گا۔ میں تم لوگوں سے اسی بینک پر ملوں گا۔ یہ کہہ کر انور نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا جو پیسے نکل آے ان دونوں میں برابر برابر تقسیم کر دیے اور پھر شہر کی طرف چل پڑے۔ ایک نکڑ پر کار کو روکا اور کار کا پٹ کھولتے ہوے کہنے لگے'' گڈ لگ ٹو یو گرلز۔ ہم لوگ پھر ملیں گے۔ اب میرا گھر جانا ضروری ہے۔ ایک کام رہ گیا ہے۔ میں بھول ہی گیا تھا۔''

دونوں لڑکیاں کار سے اُتر گئیں تو انور نے کار تیزی سے آگے بڑھادی۔ تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ کار اچانک رُک گئی۔ انور نے پٹرول کے کانٹے کا جائزہ لیا تو پٹرول ختم ہو چکا تھا۔ انھوں نے پھر ایک بار چابی گھمای تو کار سے گھرر، گھررکی آوازیں آتی رہیں۔ تب انھوں نے کار کو سائیڈ میں لے کر اسے مقفل کیا اور سڑک کی طرف دیکھنے لگے کہ شاید کوی سواری مل جاے۔

✠ ✠ ✠

واماندگیٔ شوق

بینا کماری کا چرچہ سارے شہر میں تھا۔ ریڈ ایریا کے سب ہی گاہک جانتے تھے کہ بینا کماری جیسی حسین اور باکمال عورت کوی دوسری نہیں مل سکتی۔ بہت جلد یہ شہرت ریڈ ایریا سے باہر بھی پہنچی۔ وہ لوگ جنھوں نے اپنی پتنی کے علاوہ کسی اور کا منہ نہیں دیکھا تھا اُن کے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔ ''بینا کماری سے ملنا سورگ کی سیر کرنے کے برابر ہے۔'' یہی اُس کی شہرت تھی۔ اس جنت سے صرف وہی لوگ محروم رہتے جن کے پاس دولت کی فراوانی نہ تھی اور وہ جو اپنا پیسہ صرف جائز ضرورتوں پر خرچ کرنا جانتے تھے۔

بینا کماری کے کمرے میں داخل ہونے والا کیسا ہی شخص ہو، تھوڑی دیر کے لیے وہ اپنے حواس کھو بیٹھتا۔ ہکا بکا ہوکر کمرے کی زیبائش سمجھنے ہی میں لگا ہوتا کہ اُس کے سامنے ایک ایسی عورت آکر کھڑی ہو جاتی جسے دیکھ کر گمان ہوتا کہ وہ سنگِ مرمر کا تراشا ہوا ایک مجسمہ ہے۔ گلابی رنگ کی مہین ساڑی کے اندر سے جھانکتا ہوا مرمریں جسم، بغیر آستین کا بلوز اور صندلی رنگ کی سڈول باہیں، سینہ کا اُبھار کسی یونانی دیوی کی طرح، نہ زیادہ نہ کم۔ گاہک تھوڑی دیر تک چپ چاپ مبہوت کھڑا رہتا۔ اُسے کچھ سدھ بدھ ہی نہ رہتی کہ کیا کہنا یا کیا کرنا ہے۔ بینا کماری ہی کو پہل کرنی پڑتی۔ آنے والے کی طرف وہ ''ہلو'' کہہ کر ہاتھ بڑھاتی۔ اپنی باہیں پھیلا کر گاہک کی طرف آگے بڑھنے لگتی۔ اس کی عمر اور اُس کے ارادوں کو بھانپ لیتی۔ پھر اپنی دونوں باہیں اُس کی گردن میں حمائل کردیتی اور کہتی۔

''کیوں! پیارے، کیا دیکھ رہے ہو۔'' تب کہیں گاہک کے ہوش ٹھکانے لگتے۔ وہ سنبھل جاتا اور اپنے حواس قابو میں لاتا۔

اپنے گاہک کو سنبھلتا اور حواس میں آتا ہوا دیکھ کر وہ کہنے لگتی۔

''جانِ من تم مجھ کو پانے کے لیے جس قدر اُتاولے ہو رہے ہو، اُسی طرح میں بھی دیوانی ہو رہی ہوں۔ تم جیسے بانکے مرد اس دُنیا میں بہت کم ہیں۔ لو میں تو تمہارے لیے جسم و جاں سے موجود ہوں۔ جو بھی سلوک کرنا چاہو، کرلو۔ صرف ایک بنتی ہے۔ میرے ہونٹوں کو جھوٹا نہ کرنا۔ پھر میں تمہیں ایسا کچھ دوں گی کہ تم دنگ رہ جاؤ گے۔ بس ایک وعدہ کرو۔ پھر آگے بڑھو۔''

وعدہ لے کر بینا کماری اپنے کرتب شروع کر دیتی۔ گاہک کو خبر نہ ہوتی کہ اُس کا وقت کیسے گذر گیا۔ جب وہ باہر نکلتا تو اس کے سر میں صرف بینا کماری کا سودا سمایا ہوتا۔

اسی شہر میں ایک معتبر تاجر شیخ جمال بھی رہا کرتے تھے۔ ان کی عبادت اور نیکی سارے شہر میں مشہور تھی۔ ان کی دو بیویاں اور چند بچے تھے۔ گھر میں ایک عبادت خانہ بھی تھا جہاں پانچوں وقت کی نمازیں ہوتی تھیں۔ بیویوں کے لیے الگ الگ گھر تھے۔ دونوں گھروں کے بیچ ایک کمپونڈ تھا۔ ساتھ میں ایک دیوان خانہ بھی، جو صرف ان کے اور ان کے دوستوں کے لیے مخصوص تھا۔ یہیں پر چھٹیوں کے دنوں میں دوست احباب اور رشتہ داروں کے نجی مسائل حل ہوتے۔ ایک ہی طرح کے ماحول سے وہ کبھی کبھی اُکتا جاتے لیکن اُن کے من میں کسی تفریحی یا کسی لغویات میں پڑنے کا کبھی خیال نہ آیا۔ ایک دن شیخ فریس مہمان بن کر ان کے گھر آئے۔ دونوں بچپن کے دوست اور لنگوٹے یار تھے۔ اس زمانے میں نماز روزے کی اس قدر پابندی نہ تھی۔ شیخ فریس تو کبھی پابند صوم وصلوٰۃ ہو نہ سکے۔ بیرونی ملکوں کی سیر نے اُن کے نظریات کو اور بھی بدل کر رکھ دیا تھا۔ دونوں کے والدین میں گہری دوستی تھی اور سچ پوچھیے تو شیخ فریس کے باپ ہی کی مدد سے شیخ جمال کے باپ نے اپنا کاروبار شروع کیا تھا۔ پھر جب شیخ فریس وقت سے پہلے یتیم ہو گئے تو شیخ جمال کے والد ہی نے انھیں اپنے بیٹے کی طرح پالا تھا۔ شیخ فریس اور شیخ جمال برسوں کے بعد ملے تھے۔ باوجود ذہنی اختلاف کے دونوں یہ چاہتے تھے کہ چند دن ایک ساتھ گذار لیں۔

یوں ہی ایک ہفتہ گذر گیا تو ایک رات سونے سے قبل شیخ فریس نے شیخ جمال سے کہا۔

''یار تم تو نماز روزے کے آدمی ٹھہرے، تاہم تمہیں خبر تو ہوگی کہ اس شہر میں بینا کماری نام کی ایک عورت بھی رہتی ہے۔ بڑا چرچہ ہے اس عورت کا۔''

''ہاں رہتی ہے۔ سنا تو ہے۔ میں تو تمھیں وہاں جانے سے روک نہیں سکتا، لیکن کبھی تمہارا خیال وہاں جانے کا ہوا تو میرے گھر سے سیدھا وہاں نہ جانا اور نہ اُس عورت کے پاس سے نکل کر سیدھے میرے گھر آنا۔ اس حد تک تمھیں اجازت ہے لیکن شہر میں کسی کو پتہ نہ چلے کہ میرے بچپن کا دوست شیخ فریس بینا کماری کے پاس گیا تھا۔

''یہ تو ممکن نظر نہیں آتا۔''

''جانتے ہو اس شہر میں میری توقیر اس لیے ہے کہ میں کبھی لغویات میں نہیں پڑتا۔ تمھیں ایک ترکیب بتاتا ہوں۔ میرے پاس سے نکلتے ہوئے اپنے بریف کیس میں ایک دوسرا لباس رکھ لینا۔ یہاں اتنے سارے ریلوے ریسٹ روم ہیں۔ کسی بھی ریسٹ روم میں جا کر لباس تبدیل کر لینا اور پھر جب بینا کماری کے پاس سے نکلو تو پھر اُسی طرح اپنا لباس بدل لینا۔ رات کے وقت تو کسی کو پتہ نہ چلے گا کہ میرا مہمان شیخ فریس، بینا کماری کا گاہک بن کر اُس کے پاس گیا تھا۔ کسی بھی دوسرے شخص کو ہرگز اجازت نہ دیتا۔ تمہارا معاملہ الگ ہے۔

شیخ فریس نے اس ترکیب کو استعمال کیا اور وہ ایک رات سیدھا بینا کماری کے کوٹھے پر پہنچ گئے۔ اُنھوں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا اور کئی ممالک کی چراگاہوں کی گھاس کھائی تھی۔ جب بینا کماری اُن کے سامنے آئی اور جب اُن کی نظریں اُس کے چہرے پر پڑیں تو اُنھیں لگا کہ وہ کسی عورت کے چہرے کو نہیں بلکہ آسمان سے ٹپک پڑی کسی پری کو دیکھ رہے ہیں اور پھر جب بینا نے اپنی نظریں اُٹھا کر شیخ فریس کی طرف دیکھا تو انھیں اُس کی آنکھیں ہیرے کی کنیاں لگیں۔ ابھی وہ اسی محویت کے عالم میں تھے کہ بینا نے اپنا دایاں ہاتھ اُن کی طرف آگے بڑھاتے ہوئے کہا ''حضور آپ۔ نے تو ابھی میرا چہرہ ہی دیکھا ہے۔ ابھی سارا جسم باقی ہے۔ صرف چہرہ دیکھتے رہو گے تو سارا وقت اسی میں کٹ جائے گا۔

شیخ فریس کی نظریں اب جو بینا کے چہرے سے پھسل کر اُس کی ہتھیلی پر پڑیں تو انھیں لگا کہ وہ کسی عورت کا ہاتھ نہیں بلکہ کوئی صندلی کٹورا دیکھ رہے ہیں اور اُس سے جڑی ہوئی مخروطی شکل کی اُنگلیاں۔ وہ اپنا ہاتھ بینا کے ہاتھ کی طرف بڑھانا بھول گئے۔ بینا نے مزید وقت ضائع کیے بغیر اپنی دونوں باہیں پھیلا کر شیخ فریس کے گردن میں حمایل کر دیں۔ تب کہیں جا کر شیخ فریس کو ہوش آیا۔ کہنے لگے۔

''میں ساری دُنیا گھوم آیا لیکن تم جیسی حسین اور نرم و نازک عورت کہیں نہیں دیکھی۔ حیرت ہوتی ہے کہ تم جیسی عورت اس شہر میں کیوں پڑی ہے۔ دُنیا میں کتنے بلند رتبے کے اور دولت مند لوگ نہ ہوں

گے جو تمھیں اپنے گھر کی زینت نہ بنانا چاہتے ہوں۔ کیا تمھیں ابھی تک کسی ایسے شخص سے سابقہ نہیں پڑا؟''

''جناب نہ مجھے پیسے کا لالچ ہے اور نہ مجھے کسی بلند رُتبے کی ہوس ہے۔ میں اپنی طرح سے جینا چاہتی ہوں اور جی رہی ہوں۔ نہ میں کسی کی خوشامد کرتی ہوں، نہ کسی سے خوشامد کرواتی ہوں۔ میرا گاہک جتنی دیر میرے پاس ٹھہرنا چاہتا ہے اُسی حساب سے میں پیسے لیتی ہوں۔ کبھی کوئی گاہک مجھ پر مہربان ہو کر اپنی دولت نچھاور کرنا چاہتا ہے۔ میں اسے قبول نہیں کرتی۔ میرے چند اُصول ہیں۔ ان اُصولوں میں لالچ، ہوس اور رُتبے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ میں یہ نہیں جانتی اور جاننا بھی نہیں چاہتی کہ اونچ نیچ کیا ہوتے ہیں۔ لعنت بھیجتی ہوں ایسی تمام باتوں پر۔ اس سے آگے میرا کوئی منصب نہیں۔

شیخ فریس نے سوچا کہ اُنھوں نے تو صرف رُتبے اور دولت کا ذکر کیا تھا لیکن یہ عورت تو کچھ اور ہی لگتی ہے۔ کچھ دیر تک وہ سوچنے میں پڑ گئے۔

''شاید آپ سوچ رہے ہیں کہ میں نے یہ پیشہ کیوں اپنایا ہے۔ چھوٹا سا ایک جواب سن لیں کہ میں یہ پیشہ کیوں کرتی ہوں۔ چاہتی تو میں چودھراین بن کر یہ پیشہ دوسری عورتوں سے کرواسکتی تھی لیکن میں دوسروں کی محنت کا پیسہ نہیں کھانا چاہتی۔ ابتدا سے آج تک کسی اوتار یا پیغمبر نے اس پیشے کو روکنے میں کامیابی حاصل نہیں کی ہے۔ میں اس پر نادم نہیں ہوں۔ نادم اُن لوگوں کو ہونا چاہیے جو اپنی عورتوں کو گھر میں اکیلا چھوڑ کر ہم جیسی عورتوں کے پاس آتے ہیں۔

''میں نے تم سے ایسا کوئی سوال نہیں کیا ہے بینا کماری۔ غلطی ہوگئی کہ رُتبے اور دولت کی بات میں نے چھیڑ دی تھی۔ اُس کے پیچھے میرا کوئی اور مقصد نہیں تھا۔ تمھاری بڑائی اور تمھارے حسن کی عظمت میرے سامنے تھی۔''

''ایسا ہی ہے تو چلیے، بحث ختم کیجیے۔ میرا بھی کوئی ارادہ نہیں تھا۔ کبھی کبھی کوئی ذہین گاہک آجاتا ہے اور کوئی بات چھیڑ دیتا ہے تو میرا من چاہتا ہے کہ اُس سے باتیں کروں۔ ورنہ میرے پاس تو لوگ نوٹوں کی گڈی لے کر آتے ہیں۔ کوئی مجھے فاحشہ عورت کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ کوئی سمجھتا ہے کہ میں ربر کی ایک گڑیا ہوں۔ محبت کی باتیں بھی ہوتی ہیں اور کبھی اُلٹے پلٹے کام بھی ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ گاہک میرے ایک اُصول کو سمجھ نہیں پاتا۔ اپنی دولت کے برتے ضد کرنے لگ جاتا ہے اور کبھی اپنی طاقت کا استعمال بھی کرتا ہے۔ سب سے برا وقت تو یہی ہوتا ہے۔ آپ کو یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی ہوگی۔ واضح کر دیتی ہوں کہ میں اپنے گاہک کو ہر بات کی اجازت دیتی ہوں بلکہ کم ہنر گاہکوں کو

بڑھیا سے بڑھیا ہنر بھی سکھا دیتی ہوں۔ بس میں ایک بات برداشت نہیں کرتی۔ میں نے اپنے ہونٹوں کو محفوظ رکھا ہے۔ ان کو کوئی چوم نہیں سکتا۔ گاہک جس طرح چاہے میرے جسم کو استعمال کرلے لیکن میرے ہونٹوں کو بخش دے۔ میں انھیں جھوٹا ہونے نہیں دیتی۔

اس ذہین عورت لیکن ایک فاحشہ کی یہ منطق شیخ فریس کو بڑی عجیب وغریب لگی۔ ہونٹوں کا پیار لیے بغیر، انھیں چومے بغیر کوئی عورت تک کیوں کر رسائی حاصل کرسکتا ہے۔ ٹھیک ہے۔ ابھی تو بہت سارا وقت ہے۔ اُن کی جیب بھی بھاری ہے۔ کتنے ہی ہتکھنڈوں سے وہ واقف ہیں۔ اُن کو اپنی جہاں دانی پر بڑا بھروسہ تھا۔ یہ سوچ کر وہ کہنے لگے۔

''بینا کماری میں تمہارے گھر میں داخل ہوکر اور تمہیں دیکھ کر تمہارے حسن میں اس قدر کھو گیا کہ ...... یوں کہو ایک جادوی کیفیت ہے، تم انسان نہیں ایک پری ہو، میں اس سے نکل نہیں پا رہا ہوں۔ پھر تم نے ایسی ذہین اور چونکا دینے والی باتیں کی ہیں کہ میری زبان پر تالے پڑ گئے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ میں تمہارے لیے کوئی ایسی اچھی بات کرسکوں گا کہ تم خوش ہوجاؤ۔''

''جی نہیں آپ مجھے خوش کیوں کریں۔ آپ کو خوش کرنا ہی تو میرا دھرم ہے۔''

''تم مجھے اگر اپنے ہونٹ چومنے نہ دوگی تو پھر مجھے خوش کیسے کرسکوگی اور پھر یہ تمہارا دھرم کیا؟''

''اے جناب ان ہونٹوں میں کیا رکھا ہے۔ میں آپ کو ایسی دُنیا کی سیر کراؤں گی کہ آپ اِن ہونٹوں کو بھول جایں گے۔''

''نہیں بینا، لبوں کو پائے بغیر میرے پاس عورت کے جسم تک پہنچنے کا کوئی تصور نہیں ہے۔''

''خیر، آپ شروع تو ہوجایں اس کے بعد آپ کو پتہ چلے گا کہ میری بات میں کتنا دم ہے۔''

''شروع ہونے کے لیے پہلا قدم تو یہی ہوگا۔ اُس کے بغیر میں کیسے آگے بڑھوں۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ میرے پیار کرنے سے تمہارے ہونٹ جھوٹے کیسے ہوجایں گے۔''

''آپ جو انھیں چومیں گے۔''

''تو اس میں جھوٹے ہونے کی کیا بات ہے۔''

''جناب آپ کو بتادوں کہ ہر روز صبح اُٹھ کر اشنان کے بعد میں اپنی دیویوں کی پوجا کرتی ہوں۔ میں نے اپنے پوجا کے کمرے میں لکشمی اور سرسوتی کی مورتیاں سجا رکھی ہیں۔ میں اُن پر پھول چڑھاتی ہوں اور اُن کے نام کے منتر جپتی ہوں۔ جن ہونٹوں سے میں اپنی دیویوں کے نام لیتی ہوں انھیں جھوٹا

کیسے ہونے دوں آپ شاید یہی کہیں گے کہ جھوٹا تو آدمی ہوتا ہے۔ میرے ہونٹ کیوں کر جھوٹے ہوں گے۔ جناب یہ میرا خیال ہی نہیں۔ یہ میرا دھرم بھی ہے۔ میرا رُتبہ بھی اسی دھرم سے قائم ہے۔''

بینا کماری نے یہ ساری باتیں بڑے نپے تلے انداز میں کہی تھیں۔ اُس کی آواز میں استحکام تھا۔ شیخ فریس نے اپنے ارادوں اور اپنے بدن کو کمزور ہوتا ہوا محسوس کیا۔ انھوں نے اپنے دماغ پر بار ڈالا اور پھر سے ہمت باندھی۔ اپنا دایاں ہاتھ بینا کماری کی کمر میں ڈالا۔ دائیں ہاتھ سے اُس کی پیٹھ کو کمان کی طرح پیچھے کی طرف جھکاتے ہوئے خود بھی اُس پر جھک پڑے۔ اپنے چہرے کو بینا کماری کے چہرے سے مَس کرنے لگے۔ بینا کماری نے کوی مزاحمت نہیں کی۔ پھر شیخ فریس نے اچانک اُسے اپنے ہاتھوں میں اُٹھالیا مانو جیسے گڑیا ہو۔ اس گڑیا کو انھوں نے دھیرے سے پلنگ پر لٹادیا۔ خود بھی اُس کے پہلو میں لیٹ گئے۔ بینا کماری نے ان کی طرف بڑی پیار سے دیکھا۔ پھر بڑی رسیلی آواز میں اُن سے کہا۔

''کیا میں اپنے کپڑے اُتار دوں؟''

شیخ فریس ابھی اس لمحے کے لیے تیار نہ تھے۔ انھوں نے جواب دیا۔'' پہلے میں تمہارے اس کنول جیسے چہرے کو خوب جی بھر کر دیکھ لوں۔'' یہ کہہ کر انھوں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بینا کماری کے سر کو اُوپر اُٹھایا۔ اُس کے گیسوؤں کو اپنی اُنگلیوں میں گھمایا۔ پھر بینا کی پیشانی کو چوما اور اب وہ بڑی تیزی سے اُس کے ہونٹوں کی طرف بڑھے۔ ان کے ہونٹ ابھی بینا کماری کے ہونٹوں تک پہنچنے نہ پائے تھے کہ بینا کماری مچھلی کی طرح اُن کے ہاتھوں سے پھسل کر دوسرے پہلو لیٹ گئی۔

''میں نے کہا نا کہ میرے ہونٹوں سے دغا نہ کرنا۔ میں تو تمہارے لیے ہر طرح اور ہر سمت سے موجود ہوں۔ پھر میرے ہونٹوں ہی میں کیا رکھا ہے۔ اب میں تمہارا موڈ اور خراب نہیں کروں گی۔ چلو ہم لوگ خاموشی سے آگے بڑھتے ہیں۔ پہلے میں اپنے کپڑے اُتار لیتی ہوں۔''

یہ کہہ کر بینا کماری نے ایک ایک کر کے اپنے سارے کپڑے اُتار دیے۔ شیخ فریس بڑی للچای اور حسرت بھری نظروں سے اُس کے برہنہ ہوتے ہوئے جسم کو دیکھتے رہے، جب وہ اپنے تمام کپڑے اُتار چکی تو وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے شیخ فریس کی قمیض کے بٹن بھی کھولنے لگی۔ پہلے قمیض پھر باقی کپڑے بھی اُتار دیے۔ ان کپڑوں کو اپنے کپڑوں کے اُوپر فرش پر پھینک دیا۔ اب شیخ فریس نے بینا کماری کی کمر کو اپنے ہاتھوں میں کس لیا۔ اُسے پھر ایک بار اپنے بازو پلنگ پر لٹادیا۔ اب وہ اُس کی پیشانی اور آنکھوں کو بار بار چومنے لگے۔ کبھی اُس کی کنپٹیوں اور رخساروں کو اپنے چہرے سے مَس کرتے اور کبھی گالوں اور ٹھوڑی

کو ہلکے سے کاٹ لیتے۔اس طرح اُس کا کوی عضونہیں چھوڑا۔ چوموں کی بوچھار سے اُس کے جسم،اُس کی پستانوں اور جھانگیوں کو جگہ جگہ سے اپنے لبوں اور لعب سے گیلا کر دیا۔ دیر تک انھوں نے اس عمل کو جاری رکھا۔ پھر اُس کے سر کو اس طرح اپنے ہاتھ میں لیا کہ اُس کی پیٹھ ان کے گود میں رہے۔اس لمحے اُنھیں لگا کہ بینا کماری کچھ بے خبری ہوگئی ہے۔تب اُنھوں نے بڑی پھرتی کے ساتھ اپنے ہونٹ بینا کماری کے ہونٹ پر رکھ دیے لیکن انھیں اچانک احساس ہوا کہ ہونٹوں کی جگہ وہاں دہن کا سخت حصہ آ گیا ہے۔ بینا کماری نے شیخ فریس سے زیادہ پھرتی کے ساتھ اپنے ہونٹ بھینچ لیے تھے اور انھیں شیخ فریس کے ہونٹوں تلے آنے سے صاف بچالیا تھا۔

''ہونٹ بھینچنے کی ترکیب تو تم نے خوب نکالی ہے'' شیخ فریس نے بینا کماری کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوے کہا۔

''اب آپ اپنے ہاتھ یہاں سے ہٹالیں۔'' بینا کماری نے شدید ناگوار لہجہ اختیار کیا۔

شیخ فریس نے اپنا جسم پرے کرلیا۔اُن کی نظریں ابھی بھی بینا کماری کے برہنہ جسم پر تھیں لیکن اُس کے چہرے کی سختی دیکھ کر انھیں یقین ہوگیا کہ اب وہ انھیں کسی طرح گوارا کرنے والی نہیں ہے۔

بینا کماری نے پہلے شیخ فریس کی طرف دیکھا۔ پھر کہنے لگی۔'' کیسے مرد ہو۔اتنا بھی نہیں جانتے کہ عورت کی مرضی کے بغیر تم اُس کے ساتھ کچھ نہیں کر سکتے۔ یوں بھی تم کچھ کرنا بھی نہیں چاہتے۔تم نے مجھے بھی کوی موقع نہیں دیا۔ورنہ میں تمھیں شاید زندہ کر دیتی۔''

ٹکٹکی باندھے شیخ فریس اُس کی طرف دیکھتے رہے۔

بینا کماری نے ایک لمبی سانس بھرتے ہوے کہا۔''تم پہلے آدمی نہیں ہو۔اس طرح کی کوشش کچھ اور لوگوں نے بھی کی ہے۔ میں اُس وقت تک چپ رہتی ہوں جب تک میرا گاہک دست درازی پر اُتر نہیں آتا۔ ایسے لوگ کبھی کبھی میرے جبڑوں کو دبا دیتے ہیں تا کہ میں اپنے ہونٹ اُن کے لیے کھول دوں۔تب مجھے اپنا طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔میری دستک پر میرے کارندے کمرے میں داخل ہو جاتے ہیں۔خجلت میں میرا گاہک بڑبڑانے لگتا ہے۔ایک بار یہاں سے بھاگ کر پھر میرے کوٹھے کا رُخ نہیں کرتا۔ مجھے یقین ہے کہ تم ایسی نوبت نہیں آنے دوگے۔ ویسے اب تمہارے اور میرے درمیان کوی سمجھوتہ باقی نہیں رہا ہے۔تم اب جاسکتے ہو۔

شیخ فریس نے ڈھیٹ پن سے کام لیتے ہوے کہا۔

''تم سمجھتی ہو کہ اپنے ہونٹوں کو بچا کر تم اپنے جسم کو پوتر رکھ سکتی ہو۔ تمہارا سارا جسم تو جھوٹا ہو چکا۔''

''اے نادان کوئی آدمی اپنے تن سے جھوٹا نہیں ہوتا۔ وہ اپنے من سے جھوٹا ہوتا ہے۔ میرے ہونٹ میرا من ہیں۔ تم میری اس سائکی کو سمجھ نہ پاؤ گے اور یوں بھی تم مسلمان ہو۔ تمہارے لیے اور بھی مشکل ہے کہ تم اس بھید کو سمجھ پاؤ''۔ یہ کہتے ہوئے بینا کماری نے اپنے کپڑے فرش پر سے اُٹھا لیے اور شیخ فریس کے لیے باہر جانے کا دروازہ کھول دیا۔

✠ ✠ ✠

غول

دریائے گندراں میں پانی پیتے ہوئے ایک خچر نے دوسرے خچر سے کہا :

''شاید تم مرتبے میں مجھ سے بڑے ہو یا ایسا سمجھتے ہو تب ہی تم ہمیشہ اُونچائی کی طرف سے پانی پیتے ہو، وہی پانی جسے تم نے منہ لگایا ہے بہہ کر میری طرف آتا ہے اور مجھے تمہارا جھوٹا پانی پینا پڑتا ہے۔''

دوسرے خچر نے جو خود بھی پانی پی رہا تھا یہ سن کر اپنا سر اُٹھایا اور کہنے لگا :

''ارے نادان دریا کا بہتا ہوا پانی کبھی جھوٹا ہوتا ہے! ویسے تم میں اور مجھ میں یہ بھید بھاؤ کہاں سے آ گیا۔ ہم ایک ہی مسلک کے تو ہیں اور ایک ساتھ پلے، بڑھے ہیں اور شاید ہمارا باپ بھی ایک ہی تھا۔''

دوسرے خچر کی آخری بات صحیح تھی کہ یہیں پر دونوں ایک ہی اصطبل کے پلے، بڑھے تھے۔ اصطبل میں اور بھی بہت سے خچر تھے۔ جن سے بار برداری کا کام لیا جاتا تھا۔ چند خچروں کو چند دوسرے خچروں پر مامور کر دیا گیا تھا۔ انھیں زیادہ سہولتیں اور مراعات دی گئی تھیں کہ وہ ماتحت خچروں کی نگرانی کریں اور ان سے اچھی طرح کام لیں۔

دراصل ساری آبادی خچروں سے بھری تھی، جو خچر نہیں تھے وہ ان سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ یہ اُن کی مجبوری تھی کہ کبھی کبھی تقاریب یا ان جیسے موقعوں پر انھیں ان خچروں کا ساتھ دینا پڑتا تھا ورنہ اندیشہ تھا کہ اُن کی کھالیں چھیل دی جاتیں اور اُن کی بھی خصی کر دی جاتی۔

پہلے خچر کی یہ بات بھی صحیح تھی کہ دوسرا خچر ہمیشہ اُونچائی سے پانی پیتا تھا، دریا پر پہنچنے تک وہ پیچھے پیچھے چلتا لیکن پانی کے قریب پہنچتے ہی وہ آگے بڑھ جاتا اور اُونچا مقام حاصل کر لیتا۔ پہلے خچر کو اس بات کا علم ہی نہ تھا کہ دوسرا خچر اُس کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اُس پر نگران تھا۔ جس صفائی سے دوسرے خچر نے جھوٹ کہا تھا اُس پر پہلے خچر نے خفت محسوس کی اور جواب میں کہا :

''تم سچ ہی کہتے ہو بھائی! مجھے سوچنا چاہیے تھا کہ بہتا ہوا پانی کبھی جھوٹا نہیں ہوتا، لیکن ہماری چھوٹی چھوٹی ندیاں تو ہمارے خون سے آلودہ ہو چکیں ہیں جانے کب بڑے دریاؤں کی باری آ جائے۔''

دوسرا کہنے لگا۔ ''تم کیوں اس کی فکر کرتے ہو۔ ہمارا بڑا آقا کبھی ایسی نوبت نہیں آنے دے گا، وہ تو چھوٹی ندیاں اور دلدل ہیں جہاں نافرمانوں اور نااہلوں کو مار کر پھینک دیا گیا ہے تاکہ دوسرے عبرت حاصل کریں۔ ہمارے آقا کا احترام کریں اور ہمارا نظام ٹھیک سے چلتا رہے۔''

یہ سن کر پہلے خچر کی آنکھوں میں آقا کا پورا ڈیل ڈول اُبھر آیا۔ آقا کے کان عام خچروں کے کانوں سے بہت بڑے تھے، وہ دیکھتا تو اکیلی اُس کی آنکھیں نہیں بلکہ کئی اور آنکھیں اُس کے لیے دیکھتیں، اُس کے کھر چوڑے چکلے تھے اور ان کی نوکیں خنجر نما، اُس کے جبڑے بھی چوڑے چوڑے اور دانت لمبے نکیلے۔ اُس کے ایالوں اور دُم کے ایک ایک بال سے چنگاریاں نکلتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ کچھ ایسی ہی صفات کم درجے میں آقا کے ساتھ رہنے والے خچروں کے جسم میں بھی تھیں۔ اُن سے کم درجے والوں میں ذرا اور بھی کم۔ عام خچر تو بس یوں ہی عام خچر تھے اور اسی لیے اپنے اُوپر والوں کا بڑا احترام کرتے اور اُن کے سارے احکام بجالاتے تھے۔

اب اُس نے دریا سے پلٹتے ہوئے اِدھر اُدھر نظر ڈالی۔ اُس کی آنکھوں میں آقا سے لے کر نچلے درجے تک کے سارے خچروں کی زندگی گھومنے لگی، اُس نے ڈرتے ڈرتے کہا :

''بھائی! یہ تو بتاؤ! ہمارا درجہ کبھی بلند ہوگا کہ نہیں؟ ہم بھی تو صبح سے شام تک کام کرتے ہیں، سامان سے لدی گاڑیاں روز روز کھینچتے رہنا، پھر شام اُسی اصطبل میں جا کر پڑے رہنا اور روکھا سوکھا جو بھی ملے کھا لینا۔ تم تو کبھی کبھی مجھے اکیلا چھوڑ کر کہیں چلے جاتے ہو۔ کام پر لگنے سے پہلے اور کام سے اُتر کر پانی پینے کے لیے اس دریا تک آنا صرف یہی ایک ہماری تفریح ہے۔''

''اس زندگی کے علاوہ تم چاہتے کیا ہو! زندگی تو ہے نا؟''

''بھاڑ میں جائے ایسی زندگی۔ میں تو بہت اُکتا گیا ہوں۔''

''تو تم چاہتے کیا ہو؟''

''کچھ کر گذرنا چاہتا ہوں۔''

''وہ کیسے؟''

''یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔تم جیسے چند اور ساتھ ہو جایں تو پھر کوی اسکیم بنای جا سکتی ہے، دوسروں سے بھی بات چل رہی ہے۔''

''دیکھو ابھی تک تو تمہیں اس دریا کا صاف وشفاف پانی میسر ہے، کبھی کبھی اچھا چارہ بھی کھانے کو مل جاتا ہے۔''

''اس غلامی میں کھایا پیا کوی چارہ یا پانی کیا اچھا اور کیا صاف وشفاف ہوسکتا ہے؟ ہمیں تو اپنی مرضی سے کبھی کچھ نہیں ملتا اور کئی ایسے خچر جو کچھ کام ہی نہیں کرتے ،عیش کرتے اور طمغے لگاے پھرتے ہیں۔''

''انھیں بھی اپنی مرضی سے کچھ نہیں ملتا۔ یہاں جو کچھ ہے صرف آقا ہی کا ہے۔لیکن آج تمہارے بھیجے میں ایسی بڑی بڑی باتیں کیوں کر آ گئیں۔ چلو اب چلتے ہیں۔ ذرا دیر ہوگئی تو تمہارے ساتھ مجھے بھی کوڑے کھانے پڑیں گے۔''

''ارے یار! میں تمہارے ساتھ کبھی کبھی تنہا بولنا چاہتا ہوں، لیکن تم ہو کہ کبھی مسکراتے بھی نہیں۔ تمہیں تو ہمیشہ کوڑوں کا ڈر لگا رہتا ہے۔''

''اگر میں تمہارے ساتھ مسکراؤں اور ہنسوں، بولوں تو ترقی کیسے کر پاؤں گا۔تم نے کبھی ہمارے آقاؤں کو قریب سے دیکھا ہے؟ وہ اُس وقت بھی نہیں مسکراتے جب اُنھیں بڑے بڑے پھولوں کے ہار پہنائے جاتے ہیں۔اُن کے غضبناک چہرے تو شیروں کی طرح ہمیشہ غصے میں رہتے ہیں۔تم نے بکریوں اور گائیوں کو تو مسکراتے ہوے دیکھا ہوگا لیکن شیر کبھی نہیں مسکراتے۔''

گفتگو کرتے ہوے دونوں خچر آگے بڑھ رہے تھے۔اُنھیں اس بات کا علم ہی نہیں تھا کہ یہ اُن کی زندگی کی آخری شام ہے۔

تیسرے دن دریا پر دونوں خچر نئے تھے، دونوں ہم خیال تھے۔وہ پانی پیتے ہوے منہ اُٹھا کر بار بار اِدھر اُدھر دیکھتے جاتے اور ساتھ میں باتیں بھی کرتے۔اتنے میں دُور سے ایک خچر اُن کی طرف آتا ہوا دکھای دیا۔

ایک نے کہا۔''وہ دیکھو! بڑے کانوں والا خچر اِدھر آ رہا ہے۔تھوڑی دیر کے لیے بالکل چپ رہو،

ورنہ وہ دور ہی سے ہماری باتیں سن لے گا اور کل تک ہماری لاشیں کسی کھڈ میں پڑی ہوں گی۔ مجھے تو اندیشہ ہے کہ وہ اپنی طرف سے ہی کچھ گھڑ نہ لے۔''

دُور سے دکھائی دیا ہوا خچر اب قریب آ چکا تھا۔ پانی پینے والے خچروں نے اُسے قریب پایا تو اُس کی طرف تیزی سے مڑے اور اپنے اگلے پاؤں کے گھٹنے اُس کے سامنے ٹیک دیے۔ سروں کو اُس کے سامنے اس طرح جھکا دیا جیسے وہی اُن کا آقا ہو۔ اُس سے بڑے آقا تو کم ہی دکھائی دیتے تھے اور سب سے بڑے آقا تک تو اُن کی رسائی ہی نہ تھی۔ آنے والے خچر نے کہا :

''شاباش! تم دونوں بڑے فرض شناس اور فرماں بردار خچر ہو۔ میں تم دونوں کا درجہ بلند کرنے کی سفارش کروں گا'' یہ کہہ کر وہ دندناتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

وہ جا چکا تو دونوں خچر کانا پھوسی کرتے ہوئے اصطبل کی طرف روانہ ہوئے۔ ایک نے کہا :

''کیا تم نے سنا کہ ایک دوسرا طاقتور ملک ہم سب کو بڑے آقا سے نجات دلانے کے لیے ہمارے ملک پر حملہ کر چکا ہے۔''

''ہاں سنا تو ہے اور یہ بھی کہ سارے حملہ آور گورخر ہیں۔ اُن کا آقا ہمارے آقا سے کئی گنا طاقتور ہے۔ اُس کے بھی کئی کان ہیں اور کئی آنکھیں۔ کھر اتنے بڑے ہیں کہ اُس کی ایک ہی لات سے ہم جیسے دس بیس خچروں کے پرخچے اُڑ سکتے ہیں۔ اُس کی آنکھوں سے نکلتی ہوئی چنگاریوں کی کوئی دُشمن تاب نہیں لا سکتا، اُس کے جبڑے اتنے چوڑے اور دانت ایسے نکیلے ہیں کہ اُن کی چنگل میں آیا ہوا کوئی بھی دوست و دُشمن پس کر رہ جاتا ہے'' اتنا کہہ کر دوسرے خچر نے ایک لمبی سانس لی پھر اپنا بیان جاری رکھا۔ ''لیکن تم نے یہ جو نجات دلانے والی بات سنی ہے وہ ایک دھوکہ ہے۔ وہ تو ہماری ساری چراہ گاہوں اور پانی کے ذرائع پر قبضہ جمانا چاہتا ہے۔ اور...... اور ہمارا آقا جیسا کچھ بھی ہے وہ ہمارا ہے۔ آج نہیں تو کل ہم اُسے نکال پھینک سکتے ہیں۔ گورخروں کی غلامی سے تو موت بہتر ہے۔ ہم پہلے کوئی ایسی ترکیب کریں کہ اپنے جابر آقا سے نجات پالیں اور پھر جب سب متحد ہو جائیں گے تو کسی بھی طاقتور ملک سے لڑنا ہمارے لیے مشکل نہ ہوگا۔''

''اوّل تو یہ ممکن نہیں کہ ہم اپنے جابر آقا سے نجات پا سکیں۔ جو بھی ہوگا ہم اس پر بعد میں غور کریں گے۔ پہلے تو دُشمن سے بچنا ہے۔ اُس کی نظریں تو ہمارے قدرتی ذرائع پر ہیں۔ ہماری ہری بھری چراگاہیں اور ہمارے بڑے بڑے دریا، ان سب پر وہ قبضہ جمانا چاہتا ہے۔''

''پہلے ہم اپنا آقا بدل دیں تو شاید ہم سب مل کر دُشمن کا جم کر مقابلہ کر سکتے ہیں دُشمن کا ملک تو گورخروں سے بھرا پڑا ہے۔''

''دُشمن کا ایک ملک ہی کیا ساری دُنیا خچروں اور گورخروں سے بھری پڑی ہے۔''

''دُنیا کو برا نہ کہو کہ دُنیا ہی خدا ہے اور خدا ہی دُنیا۔ کیا تمھیں ہمارے سوا دوسری مخلوق نظر نہیں آتی؟''

''آتی تو ہے، پر کیا کریں حکومتیں تو خچروں اور گورخروں ہی کے ہاتھوں میں ہیں۔''

''ان حاکموں کو ہم ہی نے تو قبول کیا ہے۔''

''نہیں میرے بھائی ہمیں تو موقع ہی کہاں ملا۔ میں اور تم اکیلے دکیلے ہی نہیں ہم سب ہی جبر کا شکار ہیں، ہم میں جو شامل نہیں ہیں وہی خچر اور گورخر ہونے سے بچ گئے۔ جبر سہنا تو سب کا المیہ ہے۔''

''تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ بہر حال ہمیں تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ آنے والی نسلوں کو بچانا ہے تو اپنی جانوں کو تلف کرنا ہوگا۔''

باتیں کرتے ہوئے دونوں خچر اصطبل کی طرف روانہ ہوئے تھے کہ اتنے میں دور سے مزائلز چلنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

''تم نے کچھ آوازیں سنیں؟''

''اتنی زور کی آواز تو ایک بہرا بھی سن لے گا۔''

اصطبل قریب آ گیا تو سورج کے ڈوبنے کا وقت ہو چکا تھا۔ دونوں کے دل بھی ڈوب رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ ''پھر وہی اندھیرا کمرہ۔''

''تم نے سیر ہو کر پانی پیا کہ نہیں؟''

''رات اگر پیاس نہ لگے تو سمجھو پانی جی بھر کر پی لیا ہے۔''

''دل میں خوف ہو تو کوئی کام ڈھنگ سے نہیں ہوتا۔''

''خوف کو تو ہمیں نکالنا ہی پڑے گا۔'' سنا ہے کہ دُشمن کی فوجیں آگے بڑھ رہی ہیں۔ جو خچر بندی بنائے گئے ہیں اُنھیں زنجیروں سے باندھا جا رہا ہے۔ زمین پر لٹایا جا رہا ہے اور اُنھیں ایک ہی کروٹ پڑے رہنا پڑتا ہے۔''

''نہیں اب ہمارا دُشمن آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ہم لوگ آقا کے لیے نہیں اپنی آزادی کے لیے لڑیں

گے۔ کیا تم نے نہیں سنا کہ پڑوسی ملکوں سے ہمیں مدد ملنے والی ہے۔''

''مدد ملنے والی ہوتی تو کبھی کے مل چکی ہوتی۔ میں نے یہ بھی سنا کہ جہاں جہاں دُشمن قبضہ کر رہا ہے وہاں قیدیوں کو پاؤں پر چلنے کی اجازت نہیں۔ گھٹنوں کے بل رینگنا پڑتا ہے۔ یہ کیسا عذاب ہے۔ اس سے پہلے ہمیں موت آ جاتی تو بہتر تھا۔''

''موت کی دُعا کیوں کرتے ہو۔ کیا تم اپنی آنے والی نسلوں کو غلامی میں جھونکنا چاہتے ہو؟''

اب دونوں اصطبل کے دہانے پر پہنچ چکے تھے۔ اصطبل کے خچروں میں پہلے سے موجود خچر اپنے اپنے سر باہر نکال کر آنے والے خچروں کو دیکھنے لگے۔ اُنھیں ڈر تھا کہ ان دو خچروں کے دیر سے آنے کی پاداش میں سارے اصطبل کے خچروں پر عتاب نازل نہ ہو جائے اور رات بھر سب کو بھوکا رہنا پڑے۔ یوں بھی اس اصطبل کے سارے خچر آقاؤں کی نظروں میں مشکوک تھے۔ قسمت اچھی تھی کہ چارہ لانے والا خچر وہاں دیر سے پہنچا اور وہ بڑی جلدی میں تھا، چارہ پھینک کر چلتا بنا۔

چارہ چباتے ہوئے ایک خچر نے اپنے بازو کے حجرے والے خچر کو مخاطب کیا۔ ''فرفر'' کی آواز دو بار نکالی۔ اُن کا یہی کوڈ تھا، اس آواز پر دوسرے خچر چوکنے ہو جاتے اور کان لگائے ایک دوسرے کو سننے کی کوشش کرتے۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''آنے والے خچروں سے کوئی پتہ کرے کہ دُشمن نے ہمارے شہر کی عمارتوں پر بمباری کی ہے۔ شاید ہمارے بھائیوں کی بڑی تعداد ماری گئی ہے، اُن میں چند غدار ہوں گے تو چند ہماری طرح آزادی کے متوالے بھی۔''

''جب بمباری ہوتی ہے تو غداروں اور آزادی کے متوالوں میں کوئی تفریق نہیں ہوتی۔''

''میں نے سنا ہے بموں کی وجہ مغربی شہر کی کئی عمارتیں مسمار ہو گئی ہیں۔ بار برداری کرتے ہوئے خچر بھی عمارتوں میں بیٹھے ہوئے خچروں کے ساتھ مارے گئے ہیں۔ جو بندی بنا لیے گئے اُنھیں گھٹنوں کے بل کھڑا کیا گیا ہے۔ یہ بھی سنا گیا کہ دُشمن کے جسم کے ایک ایک حصے سے گولیاں نکلتی ہیں اور جب وہ اپنی دُم اُٹھاتے ہیں تو وہاں سے بم برستے ہیں۔''

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ کئی خچروں کے دوڑتے ہوئے اصطبل کی طرف آنے کی آواز آئی۔ پیچھے کمانڈر بھی تھے اور ہتھیاروں سے لیس چند گاڑیاں بھی، ان گاڑیوں کو اصطبل کے سامنے روکا گیا۔ ایک ایک خچر کو اصطبل سے نکال کر اُن کے جسموں کو ہتھیاروں سے لیس کر دیا گیا۔ ''دُشمن ہماری سرحدوں کے

اندر گھس آیا ہے۔ اُنھیں سرحد سے نکال باہر کرنا ہے۔ یا تو ہم کامیاب ہو جایں یا پھر شہید ہو جایں۔'' یہی سب کی زبان پر تھا۔

قافلہ آگے بڑھتا گیا۔ راستے میں جو بھی خچر ملا اُسے قافلے میں شامل کر دیا گیا اور اُس کے جسم کو ہتھیاروں سے لیس کر دیا گیا۔ ابھی یہ قافلہ راستے ہی میں تھا کہ چند مزائلز ان پر آ گرے چند خچر مارے گئے، چند زخمی ہوے، بعض موقع ملنے پر بھاگ نکلے۔ اصطبل کے وہ خچر جو باغی سمجھے جاتے تھے اُن کے دل تو حریت کے جذبے سے معمور تھے۔ وہ ڈٹے رہے اور آگے بڑھتے رہے، وہ دُشمن کو اپنے زخمی کھروں ہی سے مارتے اور اپنے جبڑوں میں لینے کے لیے قریب پہنچنے کی کوشش کرتے۔ اتنے میں اُن کے جسم پر کہیں نہ کہیں سے گولی آ لگتی اور وہ وہیں ڈھیر ہو جاتے۔ بچے ہوے خچر زخمی حالت میں بھی آگے بڑھتے رہے، وہ کم نہ تھے، اُن کا ایک غول کا غول تھا۔ آخر جب دُشمن نے دیکھا کہ یہ سلسلہ ختم نہیں ہو رہا ہے اور اُنھیں اپنے سروں کو کلاشنکوف کی گولیوں سے بچانا ہے تو اُنھوں نے اپنا پٹھا یلغار کرتے ہوے خچروں کی طرف کر لیا۔ دُم ذرا اُوپر کو اُٹھای۔ پھر کیا تھا ایک ساتھ کئی بم یلغار کرنے والے خچروں پر پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے خچروں کا صفایا ہو گیا۔

میدان کو صاف پا کر دُشمن نے دوسرے محاذ کا رُخ کیا۔

مشکوک اصطبل کا ایک خچر اتفاق سے زندہ رہ گیا تھا، وہ لاشوں کے انبار سے اُٹھا اور دُشمن کے پیچھے دوڑا۔ دُشمن بہت دور جا چکا تھا، پیچھا کرنے کی لگن میں وہ رات بھر دوڑتا رہا، دوڑتے ہوے تھک جاتا تو کچھ دُور چلنے لگتا، پھر دوڑتا، پھر چلنے لگتا، اُس کے جسم سے نکلتی چنگاریاں ایک ایک کر کے بجھتی جا رہی تھیں۔ پو پھٹنے کو آی، صبح کے جھلملاتے تاروں کی روشنی میں اُسے ایک چراگاہ نظر آی۔ اس چراگاہ میں اُس نے دیکھا کہ چند خچر اور گورخر بڑی تیزی سے منہ مار رہے ہیں اور اپنا پیٹ بھر رہے ہیں۔

''اس چراگاہ کو میں جلا کر خاک کر دوں گا۔'' وہ اُس کی طرف تیزی سے دوڑنے لگا، دوڑتے دوڑتے اُسے ٹھوکر لگی۔ اُس کے گھٹنے زخمی ہو گئے، وہ اُٹھ کر پھر سے دوڑنے لگا۔ اس کے جسم میں اب صرف ایک ہی چنگاری باقی رہ گئی تھی، اُسے سنبھالے وہ دوڑتا رہا۔ پاؤں جواب دے گئے تو وہ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ ایک ایک قدم آگے بڑھانے لگا۔ چراگاہ تک تو اُسے کسی طرح پہنچنا ہے۔ فاصلے کا اندازہ کرنے کے لیے وہ ایک لمحہ کے لیے رُکا۔ اُس نے اپنا سر اُٹھایا اور چراگاہ کی طرف نظر ڈالی۔ اتنے میں سن کے ساتھ کہیں سے ایک گولی اُس کی دائیں کنپٹی میں لگی اور چیر کر بائیں کنپٹی سے نکل گئی۔ چراگاہ کے منظر کو

اپنی آنکھوں میں سمیٹے وہ جہاں تھا وہیں ڈھیر ہو گیا، پاؤں میں اتنا بھی دم نہیں تھا کہ وہ جنبش ہی کرتے۔

صبح ہو چکی تھی۔ سورج کی روشنی پھیلنے لگی تو دن کے اُجالے میں چراگاہ خچروں اور گورخروں سے خالی تھی۔ دم توڑتے ہوئے خچر کی لاش جہاں تھی وہیں پڑی رہی۔ سہ پہر ہوتے ہوتے کئی گدھوں نے اُس پر قبضہ جمالیا۔

✠ ✠ ✠

راہ گیر

حنیف اب ایک ہی راستے پر چل رہا تھا۔ اس راستے پر اُسے نہ کوئی ٹوکنے والا تھا اور نہ ہی راستہ طئے کرنے کی باریکیوں سے واقف کروانے والا۔ گرتے پڑتے، اُٹھتے بیٹھتے اُسے چلتے ہی رہنا تھا۔ سامنے حدنظر تک راستہ ہی راستہ تھا۔ اُس نے سوچا راستہ سیدھا ہے تو ایک دن منزل کو پہنچا ہی دے گا۔ منزل کیسی ہوگی اس سے وہ ناواقف تھا۔ اُسے کسی درخت کے سایے کے نیچے بھی بیٹھنے کا خیال نہ ہوا۔ رُکے گا تو منزل کا فاصلہ بڑھ جائے گا۔ تھک کر کبھی کبھی وہ اپنی رفتار دھیمی کر لیتا اور پھر آگے بڑھ جاتا۔

عرصے تک چلتے رہنے کے بعد حنیف ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں پر کئی راستے ملتے تھے۔ اتنے سارے راستوں کو دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ کون راستہ کس طرف لے جائے گا اُن پر کوئی نشان نہ تھا۔ اُسے کسی سے مدد لینی پڑے گی۔ یہ سوچ کر وہ راستوں کے بیچوں بیچ پہنچ کر کھڑا ہو گیا اور انتظار کرنے لگا کہ کوئی اُدھر سے گذرے تو اُس سے پوچھ لے گا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے دیکھا کہ چند سواریاں ان راستوں پر سے گذرنے لگی ہیں۔ ایک راستے سے کوئی آرہا ہوتا تو دوسرے سے کوئی جارہا ہوتا۔ کسی کے رُکنے کے کوئی آثار نہ تھے۔ ساری سواریاں تیز رفتار تھیں۔ روک کر کسی سے پوچھنے کی حنیف کو ہمت نہ ہوئی۔ اور کیا پتہ اُس کے روکنے پر کوئی رُکے گا بھی کہ نہیں۔ دیر تک وہ اسی مخمصے میں پڑا رہا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ اتنے میں ایک طرف سے کچھ جانور آتے ہوئے دکھائی دیے۔ ذرا قریب آئے تو حنیف نے دیکھا کہ اُن

کے پیچھے ایک آدمی ہے جو اُنھیں ہانک رہا ہے۔ حنیف دوڑ کر اُس کے پاس پہنچا اور ساتھ چلنے لگا۔ جانوروں کے ہانکنے والے آدمی کو اس کی پروا نہیں تھی کہ ایک شخص اُس کے قریب پہنچ چکا ہے اور اُس سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔ حنیف نے ''اے صاحب! اے صاحب'' کی رٹ لگا رکھی۔ دیر تک اُسے کوی جواب نہ ملا تو آگے بڑھ کر اُس نے آدمی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ آدمی اپنا کاندھا جھٹک کر جانوروں کو ہانکنے میں لگ گیا۔ ایک نئے آدمی کو قریب پا کر بعض جانور بدکنے لگے۔ حنیف کے لیے کوی چارہ نہیں تھا۔ وہ بھی ادھر ادھر بھٹکتے ہوے جانوروں کو ہنکا کر قطار میں لانے لگا۔

''یہ کیا کر رہے ہو'' آدمی چیخ پڑا۔

''میں تمہاری مدد کر رہا ہوں'' حنیف نے جواب دیا۔

''اوّل تو تم نے میرے جانوروں کو بدکایا اور اب میری مدد کا بہانہ تراش رہے ہو۔ تمہاری مدد کے بغیر ہی میں اپنی منزل پر تھا۔ تمہاری مداخلت نے معاملہ بگاڑ دیا۔ جاؤ تم اپنی راہ لو۔ مجھے کسی سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔''

''بھای ذرا میری طرف دیکھو۔ ہم دونوں کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ میں بھی تمہاری ہی عمر کا ہوں۔ طویل عرصے سے ایک ہی راستے پر چلتا آ رہا ہوں۔ یہاں بہت سے راستے ایک جگہ مل گئے ہیں۔ اتنی سی رہبری کر دو اور بتاؤ کہ کون سا راستہ کہاں جاتا ہے'' حنیف نے التجا کی۔

''تم نے یہ نہیں کہا کہ تمھیں کہاں جانا ہے۔ اگر تمھیں کہیں بھی جانا ہے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ تم میرے ساتھ چلو۔ میں صرف ایک ہی راستہ جانتا ہوں، جس راستے سے آیا ہوں اور جس راستے پر جانے والا ہوں۔ مجھے کسی دوسرے راستے سے کوی واسطہ نہیں۔ نہ میں جاننا ہی چاہتا ہوں۔''

''اتنا بتا دو کہ کہاں جا رہے ہو'' حنیف نے ایک آخری سوال کیا۔

''دیکھتے نہیں ان جانوروں کو۔ ان میں چند کو مسلخ کے حوالے کر دوں گا اور جو صحت مند اور توانا ہیں انھیں فروخت کر دوں گا۔'' آدمی نے بڑے اطمینان سے جواب دیا اور جانوروں کو ہانکتا ہوا آگے نکل گیا۔

حنیف پھر سے راستوں کے بیچ آ کھڑا ہوا۔

تھوڑی ہی دیر بعد نوجوانوں کی ایک ٹولی اُسے اپنی طرف آتی ہوی دکھای دی۔ ٹولی کے سامنے ایک آدمی بڑی جھنڈی اُٹھائے ہوے تھا۔ سب کے ہاتھوں میں بھی اُسی رنگ کی چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں تھیں۔ ٹولی کے سب ہی لوگ ایک ساتھ دوڑ رہے تھے۔ حنیف بھی اُن کے ساتھ کاندھے سے کاندھا

ملا کر دوڑنے لگا۔ وہ ہر ایک سے پوچھتا جاتا کہ کس راستے سے آئے ہیں اور کدھر جا رہے ہیں۔ ہر شخص یہی کہتا کہ ''ہم اپنے رہبر کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں کچھ نہیں معلوم۔''

تھوڑی دور دوڑ کر حنیف رُک گیا اور ناکام لوٹ کر پھر اپنی جگہ آ گیا۔ اب جو اُس نے دیکھا تو پہلے کی طرح سے تیز سواریاں راستوں پر سے گذر رہی ہیں۔ اُس نے سوچا کوئی بھی سواری کسی راستے پر مڑنے کے لیے ذرا آہستہ چلے گی تو وہ قریب پہنچ کر پتہ کرے گا کہ کون سا راستہ کدھر جاتا ہے۔ دیر تک وہ انتظار میں رہا لیکن کوئی سواری ایسی نہ ملی جس نے اپنی رفتار دھیمی کی ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد سواریوں کی آمد و رفت بند ہو گئی اور ہر طرف ایک سناٹا چھا گیا۔ یوں ہی وہ کب تک کھڑا رہے گا۔ اس خیال کے آتے ہی اُسے ایک ترکیب سجھائی دی۔ اُس نے اپنی جیب سے ایک سکہ نکالا اور اُسے زمین پر پھینکا۔ پہلی بار سکہ زمین پر چت گرا اور جہاں کا وہیں ٹھہر گیا۔ اُس نے سکہ پھر اُچھالا۔ چار پانچ بار اُس نے اسی عمل کو دھرایا۔ سکہ چت یا پٹ گرتا اور وہیں پر ٹھہر جاتا۔ آخری بار سکہ زمیں پر اس طرح گرا کہ دوڑنے لگا اور دور تک نکل گیا۔ حنیف اُس کے پیچھے پیچھے دوڑتا رہا۔ سکے کی رفتار دھیمی ہوتی گئی اور وہ ایک جگہ رُک کر گر پڑا۔ حنیف نے سکے کو اُٹھا کر جیب میں رکھ لیا اور اُسی راستے پر چل پڑا جس راستے پر سکہ گر گیا تھا۔ اُسے جانوروں کو ہانکنے والے کی بات یاد آئی کہ جو شخص یہ نہ جانتا ہو کہ اُسے کہاں جانا ہے تو وہ کسی بھی سمت روانہ ہو سکتا ہے۔

اب حنیف جس راستے پر چل پڑا تھا وہ کچھ ناہموار سا تھا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اُسے ایک درخت دکھائی دیا جس کی پیڑ تلے ایک چبوترہ تھا۔ درخت کے سائے میں چبوترے پر بیٹھے ہوئے چند لوگ تاش کھیل رہے تھے۔ وہ ان میں شامل ہو گیا۔ تاش کھیلنے والے حنیف سے بہ ظاہر بے تعلق رہے، لیکن جب حنیف دیر تک یوں ہی بیٹھا رہا تو ایک نے کہا۔ ''کیوں بھائی تاش نہیں کھیلو گے، کیا پتہ تمہاری قسمت میں جیت ہو۔'' حنیف اپنی پونجی کے بارے میں غور کرنے لگا۔ اُس کی جیب میں تھوڑا بہت سرمایہ تھا۔ کیوں نہ وہ اپنی قسمت آزمالے۔ جیت جائے گا تو جیب اور بھی بھاری ہو جائے گی۔ اس خیال کے آتے ہی اُس نے تاش کی گڈی ہاتھ میں لی اور پتے پھینٹنے لگا۔ پہلی دو بازیاں اُس نے جیت لیں، تیسری بازی ہار گیا پھر چوتھی جیت لی۔ دو تین راونڈ میں اُس کی جیب کافی بھاری ہو گئی۔ وہ وہاں سے جانے کے لیے اُٹھا۔ تاش کھیلنے والے دو آدمیوں نے ایک ساتھ کہا۔

''تھوڑے سے روپے جیت لیے کہ اُٹھ جانا چاہتے ہو۔ تمہیں معلوم ہو کہ یہاں سے جیت کر کوئی نہیں جا سکتا۔ ہاں ہار کر وہ کبھی بھی جا سکتا ہے۔''

اُن لوگوں کے تیور بتا رہے تھے کہ اگر حنیف نے اُن کی بات نہ مانی تو کوئی بھی بہانہ بنا کر وہ لوگ اُس کے سارے پیسے چھین لیں گے۔ غنیمت یہی ہے کہ وہ تھوڑی دیر تاش کھیلے اور جیتے ہوئے پیسے اُنھیں لوٹا دے۔ یہ سوچ کر وہ پھر سے تاش کھیلنے بیٹھ گیا۔ آدمی ہارنے کی ٹھان لے تو قسمت آزمانے کی ضرورت ہی نہیں۔ ایک ہی راونڈ میں حنیف نے جیتی ہوئی ساری رقم ہار دی۔ تھوڑی سی اُس کی پونجی بھی گئی۔ تب وہ وہاں سے اُٹھا تو کسی نے کچھ نہ کہا۔

''شکریہ کہ آپ لوگوں نے تھوڑی دیر مجھے دل بہلانے کا موقع دیا۔ دراصل میں ذرا اُکتا گیا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

چلتے چلتے شام ہوگئی تو ایک جگہ کھڑے ہو کر حنیف نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ایک سمت دور قمقمے جلتے ہوئے دکھائی دیے۔ ذرا آگے بڑھا تو وہ سڑک آبادی کی طرف جاتی ہوئی نظر آئی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ آبادی کے دہانے پر تھا۔ آبادی میں داخل ہو کر اُس نے پتہ کر لیا کہ یہاں کوئی ایسی سرائے نہیں ہے جہاں کم پیسوں میں ٹھیرا جا سکے۔ ہوٹلوں کا کرایہ ادا کرنے کی اُس میں سکت نہ تھی۔ رات گذر رہی تھی۔ اُس نے سوچا اتنے بڑے شہر میں قسمت آزمالے تو شاید اُسے رات بھر کے لیے کہیں پناہ مل جائے۔ غیرت ضرورت کی تابع ہو جاتی ہے۔ حنیف نے بعض ایسے گھروں پر کھٹکا دیا، جہاں اُسے توقع تھی کہ سہارا مل جائے گا لیکن اُسے مایوسی ہوئی۔ پھر اُس نے سوچا کیوں نہ کسی پارک کے کونے میں کہیں بنچ پر پڑا رات گذار لے۔ یہ سوچ کر وہ پارک کی تلاش میں نکلا۔ ایک معمولی سی ہوٹل پر رُک کر اُس نے دال روٹی کھائی۔ وہاں سے آگے بڑھا اور ایک پارک میں پہنچا۔ پارک کے ایک کونے میں بنچ پر نظر پڑی تو اُس پر بیٹھ گیا۔ ابھی وہ طئے کر نہیں پایا تھا کہ یوں ہی بیٹھے بیٹھے رات گذارے یا بنچ پر لیٹ کر تھوڑی دیر سو جائے کہ اُسے وردی میں دو آدمی قریب آتے دکھائی دیے۔

''یہ پارک راہ گیروں کے سونے کی جگہ نہیں ہے۔ یہاں سے چلتے بنو، ورنہ رات بھر لاک اپ میں پڑے رہنا ہوگا۔'' وردی پہنے ایک آدمی نے کہا۔

حنیف چپکے سے اُٹھا اور پارک سے باہر نکل آیا۔ رات بھیگ چکی تھی۔ اب اُسے کہاں پناہ ملے گی؟ ایک آخری بار وہ اپنی قسمت آزمالے گا۔ آگے بڑھنے پر اُسے ایک بنگلہ نظر آیا۔ گیٹ پر پہنچ کر اُس نے گھنٹی بجائی۔ دو توانا و تند کتے گیٹ کی طرف لپک پڑے۔ تھوڑی دیر انتظار کے بعد حنیف نے دوبارہ گھنٹی بجائی۔ کتے بدستور بھونک رہے تھے۔ ایک عورت گھر کے دروازے سے نکلی۔ ساتھ میں ایک کم عمر

لڑکا بھی تھا۔

''تم کون ہو۔اتنی رات دیر گئے میرے گھر پر گھنٹی کیوں بجای۔'' عورت نے بدگمانی اور ناراضگی کے انداز میں کہا۔ پھر وہ حنیف کے چہرے کوغور سے دیکھنے لگی۔آدمی بھلا لگ رہا ہے۔کوی مصیبت کا مارا ہوگا۔اُس نے ایک اور سوال کیا۔

''تمھیں کس کی تلاش ہے۔''

''خاتون میں ایک بھولا بھٹکا مسافر ہوں۔اس شہر میں نو وارد ہوں۔جیب میں اتنا سرمایہ نہیں کہ ہوٹل کا کرایہ برداشت کرسکوں۔رات بھر کسی دالان یا ورانڈے کے کونے میں پڑا رہوں گا۔صبح ہونے سے قبل نکل جاؤں گا۔''

حنیف نے کچھ اس انداز میں یہ باتیں کہیں کہ عورت سوچنے پر مجبور ہوگئی۔وہ اپنے بچے کا ہاتھ تھامے تھوڑی دیر کے لیے جہاں تھی وہیں پر کھڑی رہی۔پھر اُس نے اپنے کتوں کو اندر بھیج دیا اور حنیف سے مخاطب ہوی۔

''تمہارا نام۔''

''حنیف،حنیف سہروردی۔''

''سہرورد کیا تمہارے شہر کا نام ہے۔''

''مجھے نہیں معلوم،یہ نام مجھے کس نے دیا اور کیوں دیا۔میں نہیں جانتا اگر سہرورد کسی شہر کا نام ہے۔''

''تم وعدہ کرتے ہو کہ صبح ہونے سے قبل میرے گھر سے چلے جاؤگے۔سورج نکلنے سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے میں اپنے کتوں کو باندھ دوں گی۔انھیں بندھا دیکھ کر تم چپکے سے نکل جانا۔اس کے بعد میں انھیں کھلا چھوڑ دوں گی۔پہلے یا بعد میں باہر نکلنے کی کوشش کروگے تو تم ان کے حملے سے بچ نہ سکوگے۔''

یہ کہہ کر خاتون نے حنیف کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔جب تینوں ورانڈے میں داخل ہوے تو خاتون نے حنیف سے کہا۔

''تم یہیں ٹھیرے رہو۔میں تمہارے سونے کا انتظام کرتی ہوں۔'' پھر وہ خاتون اپنے بچے کے ساتھ گھر کے اندر چلی گئی۔تھوڑی دیر کے بعد ایک چٹای،دو چادریں،ایک تکیہ اور ایک تولیہ لیے آی۔ چٹای کو فرش پر ڈال دیا اور اُس پر باقی چیزیں رکھ دیں۔

''اب یہاں سو رہو،اور میں نے جیسا کہا ہے ویسا ہی کرو۔یہ چھوٹا دروازہ حمام اور ٹائلٹ کا ہے۔

تم انھیں استعمال کر سکتے ہو۔'' جاتے ہوے خاتون نے دروازہ اندر سے بند کرلیا۔

دن بھر کا تھکا ماندہ مسافر جوں ہی چٹائی اور چادر بچھا کر لیٹ گیا اُسے گہری نیند لگ گئی۔

رات کا پچھلا پہر ہوگا کہ حنیف نے اپنے پہلو میں سرسراہٹ محسوس کی۔ اُس نے نیم کھلی آنکھوں سے کروٹ بدلی۔ ورانڈے میں گھپ اندھیرا تھا۔ اُسے محسوس ہوا کہ کوئی عورت اُس کے بازو لیٹی ہے۔ حنیف کے کروٹ بدلنے کے ساتھ عورت نے اپنے ایک ہاتھ کو اُس کے ہونٹوں پر رکھ دیا جیسے کہنا چاہتی ہو کہ وہ بالکل چپ رہے۔ کسی کا چہرہ نظر نہ آے اور آواز بھی سنائی نہ دے تو کوئی کیسے پہچانا جاے۔ تاہم حنیف کو خیال ہوا کہ یہ عورت کوئی اور نہیں مالک مکان ہی ہوسکتی ہے۔ اُس نے پہلے اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کی پھر دھیرے سے کہا۔

''آپ ہی نے تو میرے لیے دروازہ کھولا تھا۔ رات بھر کے لیے پناہ دے کر بڑا احسان کیا آپ نے مجھ پر......''

وہ آگے کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن عورت نے اس دفعہ اپنی پوری ہتھیلی اُس کے منہ پر رکھ دی۔ حنیف چپ ہوگیا۔

عورت اور بھی حنیف کی طرف کھسک آئی۔ اُس نے اپنا سر حنیف کے سینے پر رکھ دیا۔ اپنے چہرے اور گالوں کو اُس کے سینے سے مس کیا۔ حنیف کے سانس لینے کی رفتار بڑھ گئی۔ اُس نے اپنا ایک ہاتھ عورت کے سر پر رکھا اور اُس کے بالوں میں اپنی اُنگلیاں پھیرنے لگا۔ اُسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ عورت کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ جوں ہی یہ خیال اُس کے دل میں آیا، عورت پھرتی سے وہاں سے اُٹھ گئی۔ اُس نے پاس پڑی ہوئی چادر کو حنیف پر اُڑھایا اور ورانڈے سے اس طرح نکل گئی جیسے وہ اِدھر آئی ہی نہ تھی۔

باقی رات حنیف نے کروٹیں بدلتے اور سوتے جاگتے میں گذاری۔ وہ حقیقت تھی یا کوئی خواب؟ پورا خواب اس طرح سے آنکھوں میں بس نہیں جاتا۔ وہ حقیقت ہی تھی جو خواب کی طرح آنکھوں میں بس گئی۔ شاید وہ خواب ہی تھا۔ مبہم مناظر تاویلات کا تانا باندھ دیتے ہیں۔ حنیف کوئی فیصلہ نہ کر پایا۔ گھر سے روانہ ہونے سے پہلے ہی اُس نے اپنی حسرتوں کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ اب یہ اُس کا پیچھا کر رہی ہیں۔ چادر کسی اور نے نہیں اُڑھائی، ٹھنڈ کا احساس ہونے پر خود اُس نے اپنے اُوپر کھینچ لی تھی۔ یہ کیوں کر ہوا کہ عورت کی اُنگلیوں کا لمس اُس کے ہونٹ محسوس کرنے لگ گئے۔ سینے پر اُس کے گالوں کی نرمی اور اپنے جسم میں اُس

کے وجود کی کیفیت اب تک باقی ہے۔ حنیف نے اپنے سر کو دو تین بار جنبش دی۔ صبح ہو چکی تھی۔ سورج نکلے گا تو جانے اُس کا کیا حشر ہوگا۔ اس خیال کے آتے ہی حنیف نے سامانِ سفر باندھا۔ اسی وقت مالکن کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے کتوں کو بلا رہی تھی۔ جب کتوں کو باندھ دیا گیا تو حنیف کو خیال ہوا کہ یہ گھر سے نکل جانے کی وارننگ ہے۔ چٹائی اور رضائیوں کو سمیٹ کر اُس نے اُنھیں گھڑی بھر کے لیے دیکھا۔ اچانک اُس کے کیا جی میں آئی کہ وہ انھیں قریب لے کر سونگھنے لگا۔ بندھے گئے کتے اب بھونکنے لگ گئے تھے۔ حنیف نے عجلت میں چٹائی اور دوسری چیزوں کو وہیں فرش پر ڈال دیا اور تیزی سے گیٹ کی طرف روانہ ہوا۔ چند قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ پیچھے سے ورانڈے کا دروازہ کھلا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ مالکن دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ اُس کے ایک ہاتھ میں چٹائی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں نمی تھی اور وہ ٹکٹکی باندھے حنیف کو دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر وہ یوں ہی دیکھتی رہی۔ حنیف جہاں کا تہاں کھڑا رہا۔

''تو آپ جا رہے ہیں۔'' خاتون نے گلوگیر آواز میں کہا۔

حنیف کو فوراً کچھ سجھائی نہ دیا۔ اُس نے اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔

''میں اپنا وعدہ پورا کر رہا ہوں۔''

''کیا میں آپ سے خواہش کر سکتی ہوں کہ گھڑی دو گھڑی کے لیے رُک جائیں۔ بچہ اسکول چلا جائے گا۔ میں آپ سے تھوڑی سی باتیں کرلوں گی۔ ایک عرصے سے کسی بھلے آدمی سے کوئی بات چیت نہیں ہوئی ہے۔''

دیر تک دونوں اپنی اپنی جگہ ساکت و سامت کھڑے رہے۔

''آپ میری طرف ایک قدم آگے بڑھائیں تو میں سارا انتظام کرلوں گی۔ ورانڈے میں صوفے پر بیٹھ کر مطالعہ کرتے رہنا۔ کتابیں دے جاؤں گی۔''

یہ کہہ کر جواب کا انتظار کیے بغیر خاتون اندر چلی گئی۔ حنیف آگے بڑھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ کچھ سوچ نہیں پا رہا تھا۔ ایک ہی خیال بار بار اُس کے ذہن میں آتا رہا۔ کیا عورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں۔ یہاں رُک جانے اور عورت سے باتیں کرنے کا کیا انجام ہو سکتا ہے۔ حنیف کے ذہن سے خواب کا بوجھ نکل چکا تھا۔ ماحول خوش گوار ہونے لگا۔ اس قدر اعتماد اور اپنائیت کے ساتھ عورت نے باتیں کی تھیں۔ حنیف کا دل جو کسی وقت اُمنگوں سے بھرپور تھا اب ویسا نہ رہا تھا۔ تاہم وہ اپنے حوصلے کو بڑھا کر زندگی میں معنی تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس خاتون نے پہلے تو میری طرف شک و شبہ کی نظر سے دیکھا تھا۔ بڑی

قیافہ شناس ہے۔ مجھے پناہ دی کہ میں کوی اُچکا نہیں ہوں۔ جراءت مندی کے ساتھ خلیق اور دردمند بھی لگتی ہے ورنہ مجھے کیوں روکتی! حنیف یہ سوچ ہی رہا تھا کہ خاتون چند کتابیں اور دو رسالے لے کر آ گئی۔ اُنھیں حنیف کے سامنے والے اسٹول پر رکھتے ہوے اُس نے کہا۔

''بس کسی دم میں ماما آ جاے گی۔ گھنٹے بھر میں بچہ اسکول چلا جاے گا۔ آپ میرے ساتھ ناشتہ کریں گے۔ تب تک جو بھی کتاب بھلی لگے پڑھتے رہنا۔''

یہ کہہ کر وہ چلی گئی اور حنیف نے وِل ڈورانٹ کی کتاب ''دی اسٹوری آف فلاسفی'' کھولی۔ یہ کتاب وہ برسوں پہلے پڑھ چکا تھا۔ پھر سے پڑھی جا سکتی تھی۔ خود وِل ڈورانٹ کی زندگی میں بڑی بے کیفی تھی۔ پھر اُس نے ایک نظر دیکھا تھا۔ کار سے اُترتی ہوی ایک خاتون اپنے بچے کو پیار کرتی ہوی بڑی شانت اور مگن لگ رہی تھی۔ اتنا چھوٹا سا واقعہ من کو شانتی دے سکتا ہے۔ اس منظر نے وِل ڈورانٹ کی زندگی کی کایا پلٹ دی تھی۔ ''اس خاتون کے طرزِ عمل سے کیا میں بھی ایسی ہی تحریک حاصل کر رہا ہوں؟'' اُس نے کتاب کھولی اور قدیم یونانی فلسفیوں کو پڑھنا شروع کیا۔ اس دوران ماما آی۔ ایک تولیہ، صابن اور دوسری اشیاء کو حمام میں رکھ کر جاتے ہوے اُس نے کہا۔

''بیگم صاحبہ، آپ کو نہانے کے لیے کہہ رہی ہیں۔''

حنیف نے ماما کی طرف ایک نظر ڈالی۔ پھر پڑھنے لگ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اُٹھا اور حمام میں داخل ہوا۔ حنیف کو لگا کہ خود اس کا معیارِ زندگی کبھی اتنا اُونچا نہیں تھا۔ حمام سے فارغ ہوا تو اُس کے پاس دھلا ہوا صاف ستھرا ایک ہی جوڑا پہننے کو تھا۔ اُسے پہن کر وہ پھر سے ورانڈے میں آ کر صوفے پر بیٹھ گیا اور جریدوں کو اِدھر اُدھر سے دیکھنے لگ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ماما پھر ورانڈے میں داخل ہوی۔

''بیگم صاحبہ آپ کو ناشتے پر بلا رہی ہیں۔''

ہاتھ میں تھامے جریدے کو حنیف نے اسٹول پر رکھ دیا پھر اپنے گال کو دائیں ہاتھ پر اس طرح رکھا جیسے اپنے پورے چہرے کو ہاتھ کا سہارا دے رہا ہو۔ اب وہ کسی سوچ میں غرق ہو گیا۔ چند منٹ بعد کسی کے آنے کی آہٹ ہوی تو حنیف نے چونک کر آنے والے کی طرف دیکھا۔ بیگم صاحبہ سامنے کھڑی تھیں۔

''چلیے، ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔''

حنیف فوراً صوفے سے اُٹھا اور خاتون کے پیچھے چل پڑا۔

ڈائننگ ٹیبل پر ناشتہ رکھا ہوا تھا۔ اطراف میں چار کرسیاں تھیں۔ حنیف ایک کرسی پر بیٹھ گیا تو

خاتون اُس کے روبرو کرسی پر بیٹھ گئی۔ نظریں چار ہوئیں تو حنیف کی زبان سے نکلا۔

''معاف کیجیے آپ کو انتظار کرنا پڑا۔ شاید آپ رات بھر جاگتی رہی ہیں یا برابر سوی نہیں۔''

خاتون بدستور اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کچھ کہے بغیر اُس نے ناشتے کی پلیٹیں اور کھانے حنیف کی طرف بڑھا دیے۔ ایک پراٹھا حنیف کے ہاتھ میں پکڑا دیا، دوسرا اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اُس نے کہا

''آپ کو حیرت ہو رہی ہوگی کہ میں نے ایک اجنبی کو رات میں پناہ دی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ صبح اُسے گھر سے نکل جانے دیتی۔ برخلاف میں نے اُسے روکا اور اب اُس کے ساتھ ناشتہ کر رہی ہوں۔ ایک طویل عرصے کے بعد میں نے کسی مرد کو اپنے اس قدر قریب پایا ہے۔''

اب دونوں نے ایک دوسرے سے نظریں ملائیں جیسے انھیں رات کا واقعہ یاد آ رہا ہو۔

حنیف نے کچھ نہ کہا تو خاتون نے گفتگو جاری رکھی۔

''میں آپ کو نہ روکتی تو شاید آپ کی روانگی کے بعد ابھی تک آنسو بہاتی رہتی۔ میں ایسی بودی عورت تو نہیں ہوں لیکن بعض لمحے ہماری شخصیتوں کو بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ آپ کی آواز میں متانت، سنجیدگی اور موسیقی کی جو کیفیت ہے، اُس نے میرے ذہن میں ایک ہلچل مچا دی ہے۔ رات آپ نے جس انداز میں پناہ کی خواہش کی تھی اُس میں صرف مدعا نہیں تھا۔ شاید حسرت تھی۔ نہیں! میں اُس کیفیت کو کسی لفظ میں ڈھال نہیں سکتی۔ تاہم میں نے آپ کو مزید آزمالیا۔ رات میں آپ کے پہلو میں تھی۔ آپ نے کوئی عجلت نہیں دکھائی۔ آپ کے ٹھہراؤ اور آپ کے سلوک کی میں گرویدہ ہوگئی۔ ایک اور آزمائش رہ گئی تھی۔ صبح ہونے پر کتوں کو زنجیر میں بندھا ہوا دیکھ کر وعدے کے مطابق آپ جب جانے لگے تو میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں آپ کے ساتھ مزید وقت گذاروں گی۔ آپ کے بارے میں جاننا چاہوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اُن لوگوں میں سے نہیں ہو سکتے جو اوروں کی زندگی کے بارے میں جاننے کے مشتاق ہوتے ہیں بلکہ آپ اپنے بارے میں بھی لوگوں کو جاننے کا موقع دیں گے۔ میں بھی اپنے بارے میں آپ کو بتانا چاہوں گی۔ ناشتے کے بعد ہمارے پاس دو بجے تک کا وقت ہے۔ تب تک بچہ اسکول سے آجائے گا۔ دوپہر کا کھانا میں اُسی کے ساتھ کھاتی ہوں۔ آج آپ بھی شامل ہو جائیں تو یہ میری خوش بختی ہوگی۔''

حنیف خاتون کی باتیں سنتا رہا۔ دونوں کا ناشتہ ختم ہوا تو خاتون نے ماما کو آواز دی۔

''ہم دونوں کی چائے بیڈروم میں رکھ دینا۔'' پھر وہ حنیف کی طرف مڑ کر بولی۔

''چلیے ہم لوگ آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں۔''

حنیف ابھی تک خالی الذہن تھا۔ حیرت کے ساتھ بے یقینی اُس پر چھائی ہوئی تھی۔

دونوں بیڈ روم میں داخل ہو کر صوفوں پر بیٹھ گئے۔ خاتون نے پھر سے کہنا شروع کیا۔

''آپ نے ابھی تک میرا نام نہیں پوچھا ہے۔ میرا نام آمنہ ہے۔ اس کے آگے ان دو ناموں میں چاہے آپ کوئی نام جوڑ دیں۔ یٰسین یا انصاری۔ آپ کو میری بے باکی شاید پسند نہ آئے۔ لیکن میں جو کچھ کہوں گی، اپنے دل سے کہوں گی۔ اس میں کوئی کھوٹ نہ ہوگا۔ میں چاہتی ہوں کہ اپنے بارے میں آپ کو سب کچھ بتا دوں۔ آپ کے بارے میں بھی جاننے کا اشتیاق ہے۔ آپ کی مرضی۔ پہلے آپ بتائیں گے یا مجھ سے سننا چاہیں گے؟''

حنیف استعجاب سے تھوڑی دیر تک ٹکٹکی باندھے آمنہ کو دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے دھیرے دھیرے کہنا شروع کیا۔

''کیوں ہم لوگ ایک دوسرے کی زندگی کو کریدنا چاہیں۔ انسان کی زندگی میں خوش گوار واقعات کم اور تلخیاں زیادہ ہوتی ہیں۔ اُنھیں دہرا کر افسردہ ہونا عقل مندی تو نہ ہوگی۔ میں بھی یہ باتیں اپنے دل ہی سے کہہ رہا ہوں۔ آپ بھی یقین کریں۔''

''ہمیں ایک دوسرے پر بھروسہ کرنا ہوگا۔''

''جی۔''

''تو بات کریدنے کی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ جب ہم لوگ دوسروں کی زندگی سے واقف ہوتے ہیں تو اُن سے قربت کا احساس بڑھ جاتا ہے۔''

''ہر شخص کے ساتھ ایسا ہونا ضروری نہیں ہے اور بعض لوگوں سے تو بغیر اُن کے حالات جانے اُن سے قریب ہونے کو جی چاہتا ہے۔''

آمنہ کو لگا جیسے حنیف اپنے بارے میں کہنے سے کترا رہا ہے۔

''ٹھیک ہے آپ نہ بتائیں۔ میں اپنے بارے میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں۔ میں تنہائی سے اوبنے لگی ہوں۔ چند برسوں بعد میرا لڑکا بھی میرے ساتھ نہ ہوگا۔''

اتنے میں ماما چائے لے کر آگئی اور حنیف کے سامنے پہلے پیش کیا۔

حنیف نے چائے کی پیالی ہاتھ میں لی اور اپنی پلکوں کو اُوپر اُٹھا کر آمنہ کی طرف دیکھا، پھر کہنے لگا

''بہتر یہی ہوگا کہ پہلے میں اپنے بارے میں آپ کو بتا دوں تاکہ آپ کو میرے بارے میں فیصلہ

کرنے میں آسانی ہو۔ میرے نام سے تو آپ واقف ہیں۔''

''حنیف سہروردی۔''

''جی ہاں! میں گولان شہر کا رہنے والا ہوں جو یہاں سے شاید دو ہزار میل کے فاصلے پر ہے۔ میرا کتابوں کا کاروبار ہے۔ مکان سے ملحق کتابوں کی دکان ہے۔ اچھی خاصی آمدنی تھی۔ میری ایک ہی لڑکی ہے جس کی عمر اس وقت چھ سال ہے۔ میں اُسے ہر روز اسکول لاتا لے جاتا تھا۔ اُس کی ماں اُسے مجھ سے چھین کر لے گئی تو اُس وقت اُس کی عمر تین سال تھی۔ کتابوں کی خرید و فروخت کے علاوہ بھی کچھ دیگر کام تھے۔ میرے غیاب میں میری بیوی دکان پر بیٹھا کرتی۔ ایک نوجوان کتابیں خریدنے کے لیے آنے لگا۔ شروع میں تو وہ ایک گاہک ہی تھا لیکن دھیرے دھیرے اُس نے شبنم کے دل میں جگہ بنالی۔ شبنم میری بیوی کا نام تھا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ مجھے شبنم سے سوال کرنا پڑا۔'' یہ کہہ کر حنیف رُکا۔ چاے کی ایک چسکی لی۔ اُسے ٹھنڈا پا کر دو بڑے بڑے گھونٹ حلق سے اُتارے اور پیالی کو بازو اسٹول پر رکھ دیا۔

آمنہ اپنی ٹھوڑی کو ہاتھ لگا کر حنیف کی طرف غور سے دیکھنے لگی۔ ''مجھے اپنی بیوی سے سوال کرنا پڑا۔'' ان الفاظ نے اُسے چونکا دیا تھا۔

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ مجھے سوال کرنا پڑا۔ میں نے کہا تھا 'تم نے اُس نوجوان کو زیادہ ہی لفٹ دے رکھی ہے''، شبنم کو جیسے اسی لمحے کا انتظار تھا۔

''تم لفٹ کی بات کرتے ہو۔ اب وہ شخص میری زندگی میں داخل ہو گیا ہے۔ اس بارے میں تم سے بات کرنا ہی چاہتی تھی۔'' یہ کہتے ہوے اس نے ذرا بھی کلفت محسوس نہ کی بلکہ اُس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ میں بوکھلا گیا۔ مجھے اس طرح کا سوال کرنا نہیں چاہیے تھا۔ میں نے سوچا شاید اسی لیے اُس کا لہجہ تلخ ہو گیا ہوگا۔ مجھے سکتے کی حالت میں پا کر اُس نے کہنا شروع کر دیا۔'' میں چاہتی ہوں کہ تم سے خلع لے لوں۔ اُمید ہے کہ تم مجھے طلاق دینے میں دیر نہ کرو گے۔'' یہ سن کر میرے جسم کا خون جم گیا۔ ہاتھوں، سینے اور پیٹھ پر چونٹیاں رینگنے لگ گئیں۔ مجھ پر کوئی بم پھٹ پڑتا تو زیادہ بہتر تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ایک سوال کیا۔'' ہماری بچی کا کیا ہوگا؟''

''وہ میرے ساتھ رہے گی، راہول نے اُسے بھی اپنے ساتھ رکھنے کا وعدہ کیا ہے۔'' ترنت اُس نے جواب دیا تھا۔

اس کے بعد میں نے ایک آخری سوال کیا۔'' تم جانتی ہو کہ میں تمھیں کس قدر چاہتا ہوں اور تبسم

کے بغیر تو میری زندگی اجیرن ہو جائے گی۔''

''ٹھیک ہے! لیکن میں بھی تو تبسم کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تم سے کوئی عداوت بھی نہیں۔ تم ایک اچھے انسان ہو، لیکن ایک اہم بات کہے دیتی ہوں۔ لڑکیاں اپنی ماؤں کے پاس ہی زیادہ محفوظ رہ سکتی ہیں۔ مجھے دُکھ ہے کہ تم میری پوری طرح سے حفاظت نہ کر سکے اور میں دُکھوں کے ساتھ نباہ کرنے کی عادی نہیں ہوں۔ یہ تو تم نے دیکھا بھی ہے کہ سورج کی روشنی جب دھیمی پڑ جاتی ہے تو میں بلب جلا لیتی ہوں۔''

شبنم کی باتیں سن کر میری زبان گنگ ہو گئی۔ روشنی مجھ میں کم رہی ہو گی لیکن اندھیرا تو میں بھی نہیں تھا۔ روشنی کی کمی اور زیادتی کا احساس تو وہی کر سکتا ہے جس نے ایک سے زیادہ روشنیاں دیکھی ہوں اور اُن کے فرق کو محسوس کیا ہو۔ میں جل بھن گیا۔ اس کے بعد میرا دماغ سوچنے کے لائق نہ رہا۔ پھر وہ وقت آ گیا کہ شبنم اور تبسم میری زندگی سے اس طرح چلی گئیں جیسے اُن کا میرے ساتھ کوئی تعلق ہی نہ رہا ہو۔ برس دو برس تک میں نے دکان سنبھالنے کی کوشش کی۔ اب مجھے یاد نہیں کہ میں کب گھر سے نکل پڑا۔ گھر اور دکان اپنے ایک دوست کے حوالے کر دیا اور اُس سے کہا کہ اگر میں واپس نہ آؤں تو انھیں اپنی ملکیت میں شامل کر لینا۔ گھر سے نکل کر ایک طویل عرصے سے ایک ہی سڑک پر چل رہا ہوں۔ کہیں کہیں سڑکوں کی بہتات پریشان کر دیتی ہے۔ میں اپنی سوجھ بوجھ سے اُنھیں منتخب نہیں کرتا۔ اسی طرح چلتے چلتے آپ کے شہر پہنچ گیا ہوں۔ آپ نے رات میں پناہ دی۔ بڑا ہی احسان کیا۔ تھوڑی دیر کے لیے اندھیرے میں روشنی ہو گئی تھی اب میں نہیں جانتا کہ میں کسی کی زندگی میں کتنا اُجالا لا سکتا ہوں۔ میرا مستقبل کیا ہے۔ یہی سوچا تھا کہ صبح صبح آپ کے گھر سے نکل پڑوں گا اور جو بھی سڑک لمبی دکھائی دے اُسے اختیار کروں گا، لیکن ایسا نہ ہوا۔ ابھی تو میں آپ کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا ہوں۔''

حنیف اپنی بات پوری کر چکا تو آمنہ نے کہا۔

''چائے ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ میں تو ٹھنڈی چائے بھی پی لیتی ہوں۔ البتہ کسی وقت اندھیرے میں چائے پینی پڑے تو گرم چائے کی طلب ضروری ہوتی ہے۔ شبنم غریب یہ نہیں جانتی تھی کہ کبھی کبھی بجلی منقطع ہو جاتی ہے۔ آپ تو کتابوں کی دُنیا میں رہے ہیں، اندھیرے کو اُجالے میں بدلنے کے گر سے بھی واقف ہوں گے۔ ایسے وقت میں بات کرنا مناسب سمجھوں گی ہم جب ایک دوسرے سے بولنے لگتے ہیں تو خود بخود فضاء میں اُجالا پھیل جاتا ہے۔ یوں تو آپ کے تنفس کی آواز بھی میرے لیے روشنی بن سکتی ہے۔ اب میں آپ کے لیے گرم چائے منگوا دیتی ہوں۔''

''نہیں اب اسے رہنے دیں۔ چائے پینے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔''

''آپ نے کہا کہ آپ اس وقت میرے ساتھ بیٹھے ہیں۔ لیکن میری تو خواہش ہے کہ اس کے بعد بھی آپ میرے ساتھ رہیں۔ میں پھر ایک بار اپنی بات دوہراؤں گی کہ میں ذرا بے باکی اور بے تکلفی سے وہ ساری باتیں کہنا چاہتی ہوں جو اس وقت میرے دل میں ہیں۔ میری زندگی کے واقعات بالکل مختلف ہیں۔ بڑی خوش گوار یادیں ہیں۔ جو صدمے جھیلنے تھے اُس سے بچ نہ سکتی تھی۔ جیسا کہ میں نے بتادیا، میرے دو نکاح ہوئے۔ دونوں شوہر ٹوٹ کر چاہنے والے تھے۔ پہلے شوہر سے لڑکا ہے جسے آپ نے صبح اسکول جاتے دیکھا ہے۔ یٰسین کی خاندانی دولت تھی۔ اب میں اُنھیں کی دولت پر گذارہ کررہی ہوں۔ اُنھیں کار تیز چلانے کا بڑا شوق تھا۔ ایک دن وہ کار کے حادثے کا شکار ہوگئے۔ اُن کے ساتھ بے شمار یادیں تھیں۔ میں اُن کی تفصیل میں نہیں جاؤں گی۔ وہ ساری یادیں یٰسین کے ساتھ دفن ہوگئیں۔ دو سال تک گھر اور باہر میرے لیے ماتم کدہ تھے۔ تیسرے سال میری ملاقات اپنے ہی کالج کے ایک ساتھی سے ہوئی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اُس نے گلف میں ملازمت ڈھونڈ لی تھی۔ چند برس وہاں رہ کر بہت کچھ کمالیا۔ وہ جب واپس آیا تو ایک دن اچانک اُس سے میری ملاقات شاپنگ سنٹر پر ہوئی۔ وہ شادی کر کے اپنی دلہن کو ساتھ لے جانے کے لیے شہر آیا تھا۔ بعض وقت ایسے واقعات ہوجاتے ہیں جن کے بارے میں ہم نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ میرے بارے میں جان کر وہ میرے گھر آنے لگا۔ پھر اُس نے گلف واپس جانے کا اپنا ارادہ ملتوی کردیا۔ کالج کے زمانے میں وہ میرا اچھا دوست تھا لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ معلوم ہوتا تب بھی ممکن نہ تھا۔ میرا پہلا شوہر میرا کزن تھا اور اُس سے میری منگنی ہوچکی تھی۔ میرا کلاس فیلو، انصاری خاندان سے تھا اور میرے خاندان میں انصاریوں کے لیے جگہ نہیں تھی۔ اُنھیں یہ رشتہ پسند نہیں تھا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا میرے پہلے شوہر نے اتنی ساری دولت چھوڑ رکھی ہے کہ میں اُسی پر بڑی خوشی سے اپنے بچے کے ساتھ گذارہ کرسکتی ہوں۔ جب انصاری سے میرا عقد ہوا تو خاندان کے چند لوگوں نے مجھ سے بائیکاٹ کیا۔ ان لوگوں کی مجھے پروا نہیں تھی۔ البتہ آگے چل کر خود انصاری سے مجھے اندیشہ پیدا ہوگیا۔ اُس کا سلوک تو پہلے جیسا ہی تھا لیکن اُس کے مزاج میں تبدیلی آنے لگی تھی۔ وہ ذرا سی بات پر بگڑ جاتا۔ اپنے پر کسی اعتراض کو بالکل برداشت نہ کرتا۔ پھر بھی تین آدمیوں کا یہ چھوٹا سا کنبہ ہنسی خوشی سے بسر کررہا تھا کہ ایک دن انصاری کا ٹرافک کے معاملے میں کسی پولیس آفیسر سے جھگڑا ہوگیا۔ وردی پہنے ہوئے پولیس آفیسر نے انصاری کی توہین کی تو دوسرے دن پستول سے لیس وہ

اُس کے دفتر پہنچا۔ اُس نے آفیسر اور اُس کے آرڈرلی پر پستول چلا دیا۔ اتنے میں آفیسر کے سیکوریٹی گارڈ نے انصاری پر اپنی رائفل سے گولی چلا دی اور اس طرح میرے دوسرے شوہر کا خاتمہ ہوگیا۔ اس واقعے کو گذرے چار سال ہو چکے ہیں۔ میں اپنے شوہروں کو بے حد چاہتی تھی۔ اُن کی توقیر کرتی تھی اور خدمت میں بھی کوی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ آج بھی میرا دل اُن کی یادوں سے تڑپتا ہے لیکن زندگی میں ایک بے کلی سی محسوس کرتی ہوں۔ کبھی کبھی یٰسین یا انصاری میرے خواب میں آجاتے ہیں۔ پھر وہ گم ہو جاتے ہیں۔ میں تنہا کبھی چھت کو اور کبھی دیواروں کو تکنے لگ جاتی ہوں۔ اب میں اپنے اور اپنے بچے کی آسودہ زندگی کی تلاش میں ہوں۔ حالات بہتر ہوں تو کوی صدمہ اور اُس کی یاد بھی خوش گوار ہو جاتی ہے ورنہ ناموافق حالات میں صدمہ اور بھی بھیانک لگتا ہے۔ دنیا ہم سب سے اپنا حق حاصل کر لیتی ہے۔ میں بھی اس دُنیا میں کچھ حق رکھتی ہوں۔ اپنے اور اپنے بچے کے لیے کسی خوش گوار ماحول کی تلاش میں ہوں۔

حنیف غور سے آمنہ کی ایک ایک بات سنتا رہا۔ ''حق'' کے لفظ پر وہ چونک پڑا۔ اُسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہے اور کیا نہ کہے، اُس نے نظریں اُٹھا کر پھر ایک بار آمنہ کی طرف دیکھا۔ آمنہ تھوڑی دیر کے لیے چپ ہوگئی۔ پھر وہ بھی حنیف کی طرف غور سے دیکھنے لگی کہ اُس کی باتوں کا اُس پر کیا ردعمل ہوا ہے

حق کا لفظ حنیف کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ دھیمے لہجہ میں وہ کہنے لگا :

''کسی کے حق کا فیصلہ ہم کیسے کریں۔ پہلے تو اُس کی سچای تک پہنچنا ہمارے لیے مشکل ہے اور اگر پہنچ بھی جایں تو وہ طاقت کہاں سے لائیں جو کسی کو اُس کا اپنا حق دلانے کے لیے درکار ہے۔ خود میں نہیں جانتا کہ اس دُنیا میں میرا کیا حق ہے اور کیا نہیں ہے۔ جو تھا وہ مجھ سے چھین لیا گیا۔ اب میں سوچتا ہوں کہ وہ میرا حق نہیں تھا۔''

اس کے بعد تھوڑی دیر تک دونوں چپ چاپ فرش کی جانب دیکھتے رہے۔ پھر آمنہ نے خاموشی توڑی۔ اُسے مایوسی کا احساس ہونے لگا تو وہ یوں گویا ہوی :

''جن تجربات سے میں گذری ہوں اُسے میں نے بیان کر دیا۔ یٰسین کے گذر جانے کے بعد میں نہیں سمجھتی تھی کہ مجھے پھر سے خوش گوار زندگی مل سکے گی۔ لیکن جب انصاری میری زندگی میں داخل ہوا تو اُس نے تھوڑے ہی دنوں میں میری جذباتی دُنیا کی کایا پلٹ دی۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ کسی بھی مرد میں عورت کو چاہنے کی بے پناہ صلاحیت ہوتی ہے۔ یہ چاہت حاصل کرنا کیا میرا حق نہیں تھا؟ یہی حق میں نے انصاری کو بھی دیا۔'' یہ کہہ کر آمنہ نے حنیف کی طرف غور سے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی

پھر کہنے لگی :

''یہ اور بات ہے کہ انصاری کے تیور بدلنے لگے تھے۔ اب وہ دور تو گذر چکا۔ میں نے ایک طویل عرصے تک انتظار کیا۔ کسی بھلے آدمی کی آمد کا۔ میں پھر سے نکاح کرنا چاہتی ہوں۔''

آمنہ نے ایک لمبی سانس چھوڑی جیسے زندگی میں پہلی بار اس نے مکمل آزادی حاصل کی ہو اس کے بعد پھر کمرے میں خاموشی طاری ہوگئی۔ ایک طویل وقفے کے بعد آمنہ نے کہنا شروع کیا۔

''ایک آخری وجہ بیان کیے دیتی ہوں۔ میں بہ ظاہر ایک سکھی زندگی گذار رہی ہوں لیکن ایک غیر محسوس درد میری ذات میں چھپا ہوا ہے۔ یہ کبھی شدت پکڑ جاتا ہے۔ میں اس درد سے چھٹکارا پانا چاہتی ہوں۔ آپ کی شخصیت میں ایک سمندر کی گہرائی اور سکون محسوس ہوتا ہے۔ میں اس کا ایک حصہ بننا چاہتی ہوں۔''

اس کے بعد آمنہ نے اچانک محسوس کیا کہ وہ بہت کچھ کہہ چکی ہے۔ اُسے ایسی باتیں نہیں کرنا چاہیے تھا۔

حنیف نے اپنی نظریں آمنہ کی طرف اُٹھائیں، اُسے خاموش پا کر کہنے لگا :

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں اس وقت آپ سے کیا کہوں۔ آپ تو بڑی صاف گو اور دیانت دار خاتون ہیں۔ شاید مجھ میں دیانت داری کا وہ وصف نہیں جو آپ میں ہے۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ اس وقت میں کتنا سچ یا جھوٹ بول رہا ہوں۔ آپ کے ان جذبات کا میرے پاس کوی بدل نہیں ہے۔ میں ایسا سمندر بھی نہیں ہوں جیسا آپ سمجھ رہی ہیں۔ ایک ایسی اُداس جھیل ہوں جس پر نیم تاریکی چھای ہوی ہے۔ آپ کے ساتھ گذری ہوی یہ ساعتیں میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔''

آمنہ کے چہرے کے رنگ کو بدلتے ہوے دیکھ کر حنیف تھوڑی دیر کے لیے رُک گیا۔ پھر کہنے لگا

''آپ کے جذبات اور احساسات کی میں صرف قدر ہی نہیں کرتا بلکہ انھیں مقدس مانتا ہوں۔ اس وقت میرے دل پر ایک بوجھ سا ہے۔ اقرار نہ کرنے کا۔ اس سے قبل کہ آپ کا بچہ اسکول سے لوٹ آے مجھے یہاں سے چلا جانا چاہیے۔ میں اب کسی کی اُمنگوں کا سہارا بن نہیں سکتا کہ یہ اُمنگیں ایک مرحلے پر ٹوٹ جاتی ہیں۔ مجھ میں ہمت نہیں کہ ایک اور صدمے کو جنم دوں اور اس میں آپ کو اور آپ کے بچے کو بھی شامل کروں۔ اس وقت تو آپ مجھے جانے کی اجازت دیں۔ میں اپنے انجام سے واقف نہیں ہوں۔''

یہ کہہ کر حنیف صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ آمنہ کی آنکھیں پھر ایک بار آبدیدہ ہوگئیں۔ اُسے

صوفے سے اُٹھنا مشکل لگتا تھا۔ مشکل سے ہاتھوں کا سہارا لے کر وہ کھڑی ہوگئی۔ پاؤں لڑکھڑانے لگے تو وہ پھر سے صوفے پر گر پڑی۔ حنیف نے اُسے سہارا دینے کے لیے آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن وہ ایسا نہ کرسکا۔ اُس نے آمنہ کے آگے اپنا سر خم کیا۔ پھر اپنے دونوں ہاتھوں سے اُسے سلام کیا اور گیٹ کی طرف چل پڑا۔

✠ ✠ ✠

کچھوے کی واپسی

ملاح منیر دوامی نے ساتویں جماعت میں جل پری کے بارے میں پڑھا تھا، اسی وقت سے جل پری اس کے ذہن پر چھائی تھی، لڑکپن میں اس کا قیاس اسی حد تک محدود تھا کہ جل پری سمندر میں رہنے والی ایک پری ہے جس کا اُوپری جسم عورت کا ہے اور نچلا دھڑ ایک مچھلی جیسا ہے، وہ سمندر کے نیچے رہتی ہوگی اور وہ کبھی مرنے والی بھی نہیں۔ ملاح منیر کو یہ بات بھی ستاتی تھی کہ جل پری دُنیا کے سارے پانیوں میں صرف ایک ہی ہوگی یا ایک سے زیادہ، جوں جوں اُس کی عمر بڑھتی گئی اس کے دل و دماغ میں جل پری کا خیال جڑ پکڑتا گیا، اس نے جلد ہی تعلیم چھوڑ دی اور سمندر کے کنارے کشتیاں چلانے کی نوکری قبول کرلی، اس کا صحیح نام دراصل منیر الدین تھا، لیکن لوگوں نے جب دیکھا کہ منیر الدین ہمیشہ جل پری ہی کی باتیں کرتا ہے اور اسی کے تصور میں مگن رہتا ہے تو پہلے انھوں نے ''جل پری منیر الدین'' بلانا شروع کیا، لیکن کسی نے جب ان سے کہہ دیا کہ منیر الدین تو کسی طرح جل پری کو حاصل کرنا چاہتا ہے کہ وہ بھی اس کے ساتھ سمندر کی تہہ میں پہنچ کر دوامی زندگی گذارے تو انھیں لگا کہ منیر الدین کو جل پری سے زیادہ اپنی فکر ہے اور وہ ایک لمبی زندگی جینا چاہتا ہے، کیا پتہ سمندر کی تہہ میں اسے دوام حاصل ہو تب سے لوگوں نے اس کا نام ''جل پری منیر الدین'' سے بدل کر ''منیر الدین دوامی'' رکھ دیا، لوگ تو اکثر پورے نام ہی سے بلاتے ''ملاح منیر دوامی''۔

جل پری کے پاگل خیال نے ملاح منیر دوامی کو لوگوں سے دور کردیا، لیکن اس تصور کے علاوہ اس نے کوئی ایسی حرکت نہ کی کہ کسی بھی شخص بچے، بوڑھے یا کسی بھی عورت کو کوئی نقصان پہنچتا، اس نے کبھی کوئی ایسی حرکت نہ کی کہ کسی کو برا لگے، کبھی کبھی لوگ اس پر طعنے کستے، بچے اس کے ساتھ کھیل تماشے کرتے تب بھی وہ کچھ نہ کہتا، بلکہ وہ لوگوں کی ہنسی خوشی میں شامل ہو جاتا اور ان کی غم واندوہ کی...... محفلوں میں بھی شریک ہوتا، غم کے موقع پر وہ چپ سادھ لیتا، اس کے خاموش اور بھیانک چہرے سے لوگ متاثر ہوتے، واویلا کرتے ہوئے اکثر لوگ اس سے لپٹ جاتے اور جی بھر کر رونے لگتے، ایسے وقت میں وہی ان کا سب سے زیادہ شریکِ غم ہوتا، اپنی کمائی کے پیسے بھی لوگوں پر خرچ کرنا اس کا معمول تھا، صرف ایک بات اس کو ناگوار لگتی، کوئی جب اس سے کہتا کہ ''میاں تم نیک خصلت اور کام کے آدمی ہو، جل پری کے پاگل خیال کو ذہن سے نکال دو۔'' تو یہ سن کر وہ بنا کوئی جواب دیے وہاں سے چلا جاتا۔

جوانی کا اچھا خاصا وقت گذر گیا تو لوگوں نے دیکھا کہ ملاح منیر دوامی اپنا کام ختم کرنے کے بعد ہر شام سمندر کے کنارے دور دور تک چلتا رہتا ہے، کبھی کبھی تو وہ چاندنی راتوں میں رات رات بھر سمندر کی سطح پر نظریں جمائے بیٹھا رہتا ہے کہ کسی رات کے سناٹے میں سمندر کی سطح پر کوئی جل پری نمودار ہوگی تو وہ اس کا سواگت کرے گا، کئی برس تک اس نے اپنی کمائی سے پیسے بھی بچائے، ان پیسوں سے جب بھی موقع ملا اس نے سمندر کا سفر کیا، تنہا تنہا اس نے کئی کئی دن اور کئی کئی راتیں سمندر کے ساحل پر کھڑے کھڑے گذار دیے، لیکن جل پری کی کوئی جھلک یا اس کا کوئی سایہ تک اُسے نظر نہ آیا۔

ایک دن ملاح منیر دوامی نے طے کرلیا کہ وہ جب تک جل پری کو پا نہ لے گا کوئی دوسرا کام نہیں کرے گا، یہ سوچ کر اس نے ایک تھیلی میں کچھ پھل اور کھانے پینے کا سامان بھر لیا اور ایک صبح سمندر کے کنارے کنارے چل پڑا، دو دن اور دو راتیں گذر گئیں، دن دن بھر چلتا رہا، بھوک پیاس پر وہ گھڑی دو گھڑی کے لیے رک جاتا اور کچھ کھا پی کر پھر سے آگے بڑھ جاتا، ہر لمحہ اس کی نظریں سمندر کی طرف ہوتیں، کبھی سمندر میں کوئی لہر اُٹھتی تو وہ اسے غور سے دیکھنے لگتا۔ ان دو دنوں میں اس نے بے شمار سمندری جانور دیکھے، طرح طرح کے پرندے بھی، سمندر کا پانی اُوپر اُٹھتا ہوا نظر آتا تو اس کے دل میں اُمید کی ایک کرن پھوٹتی، لیکن بہت ہی جلد اسے مایوسی کا شکار ہونا پڑتا، کیوں کہ اس اُٹھتے ہوئے پانی میں سے کوئی جانور نمودار ہوتا اور کبھی تو وہاں کچھ نہ ہوتا۔ تیسرے دن کی شفق پھوٹی تو وہ جگہ سمندر کے ساتھ ساتھ پہاڑی علاقے اور جنگل کی تھی، ملاح منیر کی اُمیدیں بڑھ گئیں، شاید ایسے ہی پر اسرار ماحول میں جل پری آتی

ہوگی۔ سمندر کا ایسا منظر اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، کائنات کی کوئی بھی ایسی روح جسے یہاں تک پہنچنے کی بضاعت ہو بھی نہ کبھی ضرور آتی ہوگی، نیلگوں آسمان، فرحت بخش دھوپ، پھولوں سے لدے ہوئے پودے، اُونچی نیچی پہاڑیاں جن میں سمندر کا پانی دور دور تک خلیج بنا کر گذرتا ہوتا۔ اس پہاڑی ساحل کے منظر کا لطف اُٹھانے کے لیے فرشتے بھی یہاں آتے ہوں گے۔ ملاح منیر نے سوچا اب وہ یہاں سے کہیں نہیں جائے گا، جل پری اسے یہاں ضرور مل جائے گی، منظر کی کشش اور جل پری کے مل جانے کی اُمید نے اس کے دو دن اور دو راتوں کی تھکن کو دور کر دیا، اپنے کو چاق و چوبند محسوس کرتا ہوا تیز تیز چلنے لگا، شام سے پہلے وہ پورے ساحل کو پار کرنا چاہتا تھا اور اس نے پار کر بھی لیا، لیکن دن بھی یوں ہی گذر گیا، ایک جگہ اس نے ایک ساتھ چھوٹے بڑے کئی مونگے پائے، وہاں رک کر اس نے ایک ایک مونگے کو ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ کسی انسان کو دیکھ کر جل پری اپنے کو سکڑا لیتی ہوگی اور کون جانے اس نے کسی مونگے کے خول میں پناہ لے لیا ہو تب ہی تو وہ لوگوں کو نظر نہیں آتی، شاید انجانے میں ہی کبھی کسی کی نظر جل پری پر پڑ جائے۔ اسے کوئی مونگا بھی ایسا نہیں لگا جو وزنی ہو اور جس میں جل پری کے سما جانے کا امکان ہو، یہ جستجو بھی اکارت گئی۔ اب ملاح منیر نے ساحل کی ایک ایسی جگہ تلاش کر لی جو سب سے زیادہ دلکش تھی، وہ یہیں بیٹھ کر سمندر کی طرف نظریں جمائے رکھا۔ چاندنی رات تھی اور اسے یقین تھا کہ اس کی یہ لگن یوں ہی بے کار نہ جائے گی، جل پری نے اسے دیکھا بھی ہوگا اور وہ ملاح منیر دوامی کے عشق کا امتحان لے رہی ہوگی۔ انسانوں کی تلاش میں پریاں آتی ہی رہتی ہیں، کسی جل پری کو منیر دوامی سے بہتر کوئی آدمی نہیں مل سکتا۔ ملاح منیر کی نیکیاں انسانوں میں اس قدر مشہور ہیں تو انسانوں سے بالاتر روحوں سے یہ بات کس طرح چھپی رہ سکتی ہے، اس کا سچا عشق اسے یقین دلا رہا تھا کہ اب وہ گھڑی آ پہنچی ہے کہ کوئی جل پری اس تک پہنچے گی، اس نے کئی بار اپنی آنکھیں بند رکھیں اور ایسے بیٹھے رہا جیسے کوئی مراقبہ میں بیٹھتا ہو، تین دن اور تین راتوں کی تھکن تھی صبح صبح اس کی آنکھ لگ گئی۔

''اُٹھو! ملاح منیر دوامی، میں آ گئی ہوں، مجھے پانے کے لیے تم نے بڑی مصیبتیں جھیلی ہیں، اپنی زندگی تم نے میرے لیے وقف کر دی، تمہارا عشق سچا ہے، تم مجھے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے، اُٹھو اور اب میرے ساتھ چل پڑو۔''

ملاح منیر دوامی کو اسی لمحے کا انتظار تھا، اس نے آنکھ کھولتے ہی جل پری کو ہاتھوں میں تھام لیا۔ اُس کی پیشانی، اُس کے رخساروں اور لبوں کو بار بار چوما، پھر وہ چیخ اُٹھا'' آخر کار میں نے تمہیں پالیا، جل

پری میرا عشق سچا تھا، میری لگن کا پھل مجھے مل گیا، میں نے زندگی پالی ہے، اب میں تمہارے ساتھ رہوں گا، تمہاری خدمت میں لگا رہوں گا، یہی میری تمنا تھی، تمہیں پالینا اور تمہارے ساتھ زندگی گذارنا، مجھے اپنی منزل مل گئی، اب تمہاری چاہت ہی میری زندگی ہے، میری حیات ہے۔'' ملاح منیر جانے کیا کہنا چاہتا تھا، لیکن جل پری نے اُسے مزید کہنے سے روک دیا اور کہا ''ادھر دیکھو ـــــ یہ کچھوا ہماری سواری کے لیے ہے، روز یہ مجھے سمندر کی تہہ میں میرے ٹھکانے پر لے جاتا اور پھر دوسرے دن مجھے سمندر کے کنارے لے آتا ہے ـــــ اس ساحل پر تو میرے چند لمحے ہی گذرتے ہیں، بس پل دو پل کی بات ہے۔'' یہ کہہ کر جل پری نے ملاح منیر دوامی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے لے کر کچھوے پر سوار ہوگئی، ان دونوں کے سوار ہوتے ہی کچھوے نے سمندر میں غوطہ لگا دیا۔

آن کی آن میں ملاح منیر نے اپنے آپ کو ایک ایسے محل میں پایا، جس کے چاروں طرف باغ ہی باغ تھے، کھڑکیوں میں سے جھانک کر دیکھا تو دونوں طرف دودھ اور شہد کی ندیاں بہہ رہی ہیں، طرح طرح کے پھلوں اور پھولوں سے لدے درخت ـــــ ایسا مقام تو اس نے کہیں دیکھا نہ تھا، ملاح منیر نے سوچا شاید یہی وہ مقام ہے جسے لوگ بہشت کہتے ہیں ـــــ فردوس بریں ـــــ جل پری باہیں کھولے سامنے کھڑی تھی ـــــ ملاح منیر اپنی ساری سدھ بدھ کھو چکا تھا اور بات کرنے کے لائق بھی نہ تھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز حلق ہی میں اٹک کر رہ گئی، ایسے میں جل پری نے اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگی :

''تم اس طرح کب تک حیرت سے تکتے رہو گے، یہ محل، یہ سارے باغات ـــــ یہاں کی ایک ایک شئے یہ سب تمہارے لیے ہیں، مجھ پر بھی تمہارا ہی حق ہے، تم جو چاہو گے وہی یہاں ہوگا'' یہ کہہ کر جل پری نے ملاح منیر کے کاندھوں کو جھنجھوڑا تو اس نے اپنے آپ کو ہوش میں پایا، بے اختیار اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے اور جل پری کے سامنے جھک گیا۔

''تم ایسا نہیں کر سکتے، میں نے کہا نا کہ یہاں کی ہر چیز تمہارے حکم کی تابع ہے، تم جو کچھ بھی سوچو گے وہی ہو جائے گا، حکم کرو میرے آقا!''

جل پری کا اتنا کہنا تھا کہ ملاح منیر کی ساری اُمنگیں جاگ اُٹھیں ـــــ جل پری کا پورا پیکر اس کے سامنے تھا، اس نے دونوں ہاتھوں سے جل پری کو سمیٹ لیا، اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

'' جل پری مجھے صرف تمہیں پا لینے کی لگن تھی ، تم مل گئیں ، یہ محل اور یہاں کی ساری کائنات تمہارے مقابلے میں ہیچ ہے ، مجھے تمہاری ، صرف تمہاری ضرورت تھی ، تمہیں پا کر میں نے ساری کائنات پالی ہے ، اب میری کوی آرزو نہیں ، مجھے اپنی ساری زندگی تمہارے پیار میں گذار لینے دو '' یہ کہہ کر ملاح منیر دوامی نے جل پری کو اپنی بانہوں میں بھینچ لیا اور اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ پیوست کر دیے۔

وہ دن تھا کہ رات تھی —— مہینہ کہ برس یا صدیاں ، جانے کتنا عرصہ بیت گیا ، ملاح منیر دوامی کی باہیں ذرا ڈھیلی پڑیں تو اس نے اپنے ہونٹ بھی جل پری کے ہنٹوں سے ہٹا لیے ، پھر جل پری کا ہاتھ تھامے محل سے باہر نکل پڑا ، ایک باغیچہ سے دوسرا باغیچہ ، ایک ندی سے دوسری ندی ، جل پری کی کمر میں ہاتھ ڈالے کبھی اس کے گال ، کبھی گردن کو چھوتا ہوا اور کبھی اس کے بالوں میں اُنگلیاں دھنسائے وہ گھومتا پھرتا رہا —— وہ دن تھا کہ رات تھی ، مہینہ کہ برس یا صدیاں ملاح منیر بس ایک ہی تصور میں مگن تھا کہ جل پری اب اس کی ہے ، دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے ، گھومتے رہے ، نہ بھوک نہ پیاس ، نہ بڑھاپے کا احساس ، نہ موت کا اندیشہ ، اسی طرح چلتے چلتے ملاح منیر ایک موڑ پر اچانک رک گیا ، اس نے کہا '' جل پری ، مجھے نہیں معلوم کہ کتنا عرصہ بیت گیا تمہارے ساتھ رہتے رہتے ، اب اچانک مجھے یہ احساس ہو چلا ہے کہ یہاں سوائے تمہارے اور میرے کوی جاندار نہیں ہے ، جتنی دل فریب چیزیں یہاں دکھای دیتی ہیں ، وہ سب کی سب بے جان ہیں ، یہاں تک کہ یہ ندیاں جو بہتی ہوی دکھای دیتی ہیں وہ بھی بہتی نہیں ، اس کا بھی علم نہیں کہ یہ کہاں سے نکلتی ہیں اور کہاں جا رہی ہیں تاہم مجھے کسی سے کوی سروکار نہیں ہے ، جل پری مجھے تو صرف تمہارے چاہت اور قربت درکار ہے ، وہ مجھے حاصل ہے ، اس کے علاوہ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔''

یہ سن کر جل پری ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی اور ملاح منیر کی طرف شبہ کی نظروں سے دیکھنے لگی۔ جل پری کو اس طرح دیکھتے ہوے پا کر ملاح منیر نے اپنے آپ کو فوراً سنبھالا اور پھر سے کہنے لگا :

'' میں کچھ اور نہیں چاہوں گا ، تم اگر مہربانی کر سکو تو کبھی کبھی مجھے گھڑی دو گھڑی کے لیے ساحل تک لے چلو کہ وہاں پہنچ کر میں اپنی کشتیوں پر ایک نظر ڈال لیا کروں گا اور ان لوگوں سے مل لوں گا جو مجھ سے مل کر اپنے دُکھوں کا مداوا پا لیتے ہیں۔''

یہ سن کر جل پری کے ہونٹوں پر نا اُمیدی کی ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ کہنے لگی '' ملاح منیر ابھی تو تم نے میرے ساتھ ایک ہی دن گذارا ہے ، میں پھر دھوکا کھا گئی ، سوچا تھا کہ شاید تم اپنے ارادے کے

کچھ تو پکے انسان ہو گے، کسی خیال مستقل نباہ تو تم لوگوں سے ممکن ہی نہیں، میں تو بہر حال تمہاری تابع ٹھیری، تمہاری کوی بات ٹال نہیں سکتی، اب چلو کچھوے کا دن بھی پورا ہو گیا ہے، تمہیں ساحل تک چھوڑ آؤں۔''

''مجھے ساحل پر چھوڑ آؤ یہ نہیں ہوگا، میں تمہارے بغیر جینا نہیں چاہتا، میں تو صرف ان لوگوں کو ایک جھلک دیکھ لینا چاہتا ہوں جو میرے یہاں آنے سے دُکھی ہو گئے ہیں، لیکن تم یہ نہیں چاہتیں تو چھوڑو، میں اس خیال کو ہمیشہ کے لیے بھول جاؤں گا۔''

''اب تم اس خیال کو بھول نہ سکو گے، تھوڑی ہی دیر بعد پھر یہ خیال تمہیں ستاے گا، تم میرا وہ سحر توڑ چکے جسے میں نے مشکل سے تمہیں پا کر حاصل کیا تھا، میں نہیں چاہتی کہ تمہارے ساتھ یہ بار بار ٹوٹے، چلو اب کچھوے کو بھی دیر ہو رہی ہے، پھر بھی دوسروں کے مقابلے میں بھلے آدمی ہو، میں ساحل پر تمہارا انتظار کرنا پسند کروں گی، اگر تم وقت پر لوٹ آے تو یہ میرے لیے بہتر ہی ہوگا'' یہ کہہ کر جل پری نے کچھوے کو اشارہ کیا تو کچھوا دونوں کے سامنے آ گیا، جل پری نے ملاح منیر کا ہاتھ تھاما اور وہ دونوں کچھوے پر سوار ہو گئے۔

ملاح منیر جل پری کے ساتھ جب ساحل پر پہنچا تو اسے احساس ہی نہ ہوا کہ اس کا سفر کس طرح سے کٹا، اس نے جل پری سے بڑی منت سماجت کی اور کہا :

''تم مجھے صرف ۲۴ گھنٹوں کی مہلت دو، میں اپنے لوگوں میں ہو کر آتا ہوں، کسی طرح چوبیسواں گھنٹہ نہیں گذرے گا، تم میرا یہیں پر انتظار کرنا۔''

''میں ضرور ٹھہروں گی۔'' جل پری نے پکا وعدہ کیا تو ملاح منیر اپنے شہر کی طرف دوڑ پڑا، راستے میں کئی لوگ دکھای دیے، لیکن ان میں کوی اس کا شناسا نہیں تھا، نہ بستی اس کی اپنی تھی، کہیں کسی کو روک کر اس نے بات کرنا چاہا تو کوی بھی گھڑی بھر کے لیے بھی رُکنے پر آمادہ نہ تھا۔ ملاح منیر ہی کیا لوگ تو آپس میں ایک دوسرے سے کترا کر بھاگ رہے تھے۔ ہر شخص اپنے اپنے کام میں ایسے لگا تھا جیسے فیکٹریوں میں مشینیں لگی ہوتی ہیں، بھلے سے کوی رُک بھی جاتا تو اسے ملاح منیر کی زبان بھی پوری طرح سے سمجھ میں نہ آتی۔

ملاح منیر نے چوبیس گھنٹوں کو تین حصوں میں بانٹ لیا تھا، دو تہای آنے جانے میں اور ایک تہای لوگوں سے ملنے ملانے میں لیکن وقت تو بیتا جا رہا تھا، اپنی بستی اور اپنے کسی شناسا کی تلاش میں دو تہای وقت

گذر چکا تھا، اس نے سوچا دو ایک گھنٹے اور تلاش میں گذار دیے جایں تب بھی وہ تیزی سے دوڑ کر واپس جل پری کے پاس پہنچ جاے گا، کسی ایک بھی جانے پہچانے آدمی سے ملنا ضروری تھا، بھاگتے بھاگتے اس کی نظریں پتھر کی اس عمارت پر پڑیں جس کے ایک گوشے میں وہ پتھر بھی تھا جس پر ملاح منیر نے جل پری کی تصویر بنای تھی، وہ خاکہ اب دُھندلا ہو چکا تھا، وہ لپک کر اس عمارت کے قریب پہنچا تو پاس میں ایک بڑھیا دکھای دی، دیوار سے لگی بیٹھی بڑھیا کے سارے بال سفید ہو چکے تھے، بات کرنے میں تتلاہٹ بھی تھی، بڑی مشکل سے اس نے ملاح منیر کی بات سمجھی، ملاح منیر نے پوچھا تھا :

''بڑی بی! کیا یہ بستی وہی نہیں ہے جہاں ملاح منیر دوامی رہتا ہے؟''

جواب میں بڑھیا نے کہا'' تم کب کی بات کر رہے ہو، میں نے اپنی دادی ماں سے ملاح منیر دوامی کا نام سنا تھا، وہ کہانی اسے اس کی دادی ماں نے سنای تھی، صدیوں پرانی بات ہے، ملاح منیر دوامی یہاں رہتا تھا، وہ سب کے دُکھ درد میں شریک ہوا کرتا تھا، اپنی ساری کمای بھی اُس نے حاجت مندوں پر خرچ کر دی تھی، اس نیک آدمی کی وجہ سے بستی کے سارے لوگ خوش وخرم تھے، وہ لوگوں کی مصیبتیں بھی اپنے پر جھیل لیتا تھا، سنا کہ اُس کے اُن اچھے گنوں ہی کی وجہ سے ایک جل پری اس پر عاشق ہوگئی تھی، وہی اسے اپنے ساتھ سمندر میں لے گئی۔ وہ پھر نہیں آیا، اس کے جانے کے بعد اس بستی پر صدیوں سے نحوست چھای ہوی ہے، اب لوگ صرف اپنے لیے ہی جیتے ہیں، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایک نہ ایک دل جل پری کو ہم لوگوں پر ترس آ جاے گا اور وہ ملاح منیر دوامی کو واپس کر دے گی، ہم سب ملاح منیر دوامی کا انتظار کر رہے ہیں۔''

بڑھیا اور بھی باتیں کرنا چاہتی تھی، لیکن ملاح منیر کو یہ بات سمجھ میں نہیں آی کہ آخر اتنی صدیاں کیسے گذر گئیں، صرف دِن دو دِن ہی کی تو بات تھی، لیکن اب وہ اس بستی میں کیوں آے گا؟ کیا نیک انسان وہ اکیلا ہی رہ گیا تھا —— بڑھیا کی باتوں کو ادھورا چھوڑ کر ملاح منیر دوامی دوڑتا اور ٹھوکریں کھاتا ہوا جل پری کی طرف واپس چل پڑا، دوڑنے اور ٹھوکریں کھانے میں اُس کے پاؤں لہولہان ہو گئے، اس کی سانس پھولنے لگی، لیکن وہ بھاگتا رہا، بھاگتا ہی رہا، بھاگتے بھاگتے اس کا دَم ٹوٹنے لگا۔

منزل بہت ہی قریب تھی، لیکن چوبیسواں گھنٹہ گذرنے کو آ گیا، جل پری اُسے دور سے دیکھ ہی لے تو وہ رک جاے گی، اُس نے اپنے دوڑنے کی رفتار اور بھی تیز کر دی، ایک آخری ٹھوکر لگی۔

سمندر سے پانی کی ایک اُونچی لہر اُٹھی اور واپس ہوتی ہوی ساحل کے آس پاس کی ساری چیزوں

کو اپنے ساتھ لے گئی، دَم توڑتے ہوئے ملاح منیر دوامی نے اِتنا ہی محسوس کیا کہ اس کے سارے جسم میں جل بھر گیا ہے اور اُس کے اُوپر بھی چاروں طرف سے جل ہی پھیلتا جا رہا ہے۔

✠ ✠ ✠

نوٹ : ''ادھورا سفر'' کے مجموعے میں یہ افسانہ شامل ہے، پروفیسر سید سراج الدین صاحب نے پڑھا اور ۱۹۴۰ء کے آس پاس کا شائع شدہ جریدہ ''پیام تعلیم'' مجھے پڑھنے کے لیے دیا، اس میں ایک جاپانی کہانی میرے اس افسانے سے خاصی مماثلت رکھتی ہے، شرمندگی ہوئی کہ مجھ پر سرقہ کا الزام آسکتا ہے''وقت'' دونوں افسانوں کا مرکزی خیال ہے، پکھوے کی واپسی میں کچھ ایسے موضوعات کو بھی چھیڑا گیا ہے جو جاپانی کہانی میں نہیں ہیں۔ بڑا فرق یہ ہے کہ جاپانی کہانی بچوں کے لیے لکھی گئی ہے اور میں نے یہ افسانہ اپنے لیے لکھا ہے، ہوسکتا ہے میں نے جاپانی کہانی اپنے بچپن میں پڑھی ہو اور جل پری میرے تحت الشعور میں بس گئی ہو۔ میں سراج الدین صاحب کا ممنون ہوں کہ اُن سے مجھے ہمیشہ ہی رہبری حاصل ہوئی۔

تمہارا افسانہ ''مایا گاؤں'' ملا۔ عنوان ''مایا اور گاؤں'' زیادہ مناسب رہے گا۔ کمپوزنگ کے لیے دے دیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم کامیو کی طرح سوچتے ہو۔

شمس الرّحمن فاروقی

قدیر زماں نے مقامی، ملکی اور عالمی سیاست اور معاشرت کو خچروں کی تمثیل (غول) کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ یہ تمثیل اتنی اثر آفریں ہے کہ کہانی پڑھتے ہوے اپنے آپ پر بھی خچر ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔
صبح صبح ''شب خون'' میں آپ کا افسانہ ''ایک تھا چھچھو'' پڑھا۔ بے اختیار جی چاہتا ہے کہ داد دوں۔

مغنی تبسّم

آپ کا افسانہ ''الاؤ'' خوب ہے۔ میں نے اسے ملیالم میں منتقل کروالیا ہے اور 'ماتر وبھومی' میں چھپنے کے لیے دیا ہے۔ بہت جلد معاوضے کے ساتھ آپ کو پرچہ مل جاے گا۔

یم - ٹی - واسودیون نائر

آپ کی کہانی ''پاڑا'' سمکالین (ساہتیہ اکاڈمی) میں پڑھی۔ میں اس کا ہندی سے مراٹھی میں ترجمہ کر رہا ہوں۔ اُردو سے بھی مدد لوں گا۔ ڈی - پی - جوشی کی ادارت میں چھپنے والا ''پنچ دھارا'' مراٹھی کا معتبر اور مقبول ترجمان ہے۔ پہلے بھی آپ اس میں چھپتے رہے ہیں۔ ''پاڑا'' بھی اسی پرچہ میں شائع ہوگا۔ مزید آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ آپ کا ڈرامہ ''لنگڑا گھوڑا'' جب چھپا تو بہت مقبول ہوا۔ کئی ڈرامٹک سرکلس کے نوجوانوں نے اسے دوبارہ چھپوایا اور اسٹیج بھی کیا۔

ڈی - ڈی - بندو

رات، شعر وحکمت میں آپ کا افسانہ ''پُرسہ'' پڑھا۔ کیا خوب افسانہ ہے۔ زبان و بیان کے لہجہ نے افسانے کے حُسن میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

شہریار

ISBN : 81-900859-4-8

A.A. Graphics, Ph : +91 - 9246152456